مُتعلّقاتِ شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

متعلقات شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

© مصنف

متعلقات شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

طبع اول: ۲۰۰۸ء — صفحات: ۲۰۸ — Rs. 200/-

ناشر

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی پورہ غلامی (آواس وکاس کالونی)، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱

موبائل: 9838573645

ملنے کے پتے

- ادب کدہ، مبارک پور، انور گنج، اعظم گڑھ
- فلاحی بکڈپو مسلم مسافر خانہ روڈ تکیہ اعظم گڑھ
- دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱

MUTAALLIQAT-E- SHIBLI
Dr. MOHD. ILYAS AZMI
2008

کمپوزنگ: صلاح الدین نثار، معروفی کمپیوٹر، اعظم گڑھ

موبائل: 9889036799

انتساب

گرامی قدر

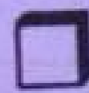
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کے نام

جب اسے دیکھا نئی روح عمل پیدا ہوئی
اس کی باتیں جب سنیں، پائی نئی تاب وتواں

(سید سلیمان ندوی)



ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ترتیب

☆ مقالات

تبریک

علامہ شبلی کی نسبتوں اور نسب کا سلسلہ جتنا معروف و مرتکز ہے وہ علم و ادب کے کسی خانوادے کو میسر نہ ہو سکا، شعری اصناف میں پنج پشت کا اظہار ملتا ہے، اس سلسلے میں ایک ہی یکتا و یگانہ ہے، مگر شجرۂ شبلی کی ہر شاخ ثمر بیز ہے، ناچیز کی نظر میں اب تو شاگردوں یا شناسانِ شبلی کی ساتویں کہکشاں بھی ہفت رنگ ہو چکی ہے، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اس علمی کارواں کے افتاں و خیزاں رہ روانِ شوق ہیں جنھوں نے سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین ندوی کے بعد مرکز سے مراجعت کی ہے، وہ اب علامہ شبلی کے افکار کی تشکیل نو کی طرف مائل ہیں، مجھے ان کے رویے میں استقرار دکھائی دیتا ہے، ان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کارکردگی کی بہتر سے بہتر صورت گری سامنے آئے گی، وہ جواں سال ہیں اور ان کے قلم کی جولانی سے توقعات بھی ہیں، دارالمصنفین کے گنج گہر بار ذخیرے سے ہمہ وقت ان کی وابستگی ان کے مطالعہ کو مہمیز کرتی رہتی ہے، زندگی کی دوسری ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہوئے شب و روز کے فارغ اوقات کو کتب بینی کی نذر کرنا ان کا معمول ہے، اس ادارے سے استفادے کی یہ صورت قابلِ رشک ہے، مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بڑا کام انجام دیں گے، اس مسودہ کے مقالے نوع بہ نوع ہیں اور سابقہ تحریروں سے کہیں زیادہ خیال افروز مثالوں کے مالک ہیں، زیر تسوید تصنیف مختلف اوقات میں لکھے گئے مقالوں پر مشتمل ہے، ان میں خوشگوار تنوع ہے اور تفکر بھی، اور اچھی بات یہ ہے کہ ان میں تکرار نہیں ہے، اگرچہ مسودے مختلف زمانوں میں مکمل کئے گئے، اور مذاکروں میں پیش کئے گئے ہیں، ان میں چند عنوانات خاصی اہمیت رکھتے ہیں، جیسے عہد حاضر میں علامہ شبلی کے منصوبوں کی معنویت، علامہ شبلی کے تاریخی مقالات، شبلی کی اردو شاعری، تذکرہ گلشن ہند اور علامہ شبلی وغیرہ۔ ان میں سب سے زیادہ معلوماتی مضمون تصانیف شبلی کے تراجم ہے، اس سے ناچیز بہت متاثر ہوا، علامہ کی تصانیف کے مختلف زبانوں میں تراجم کو بڑی کاوش سے جمع کر کے ان کا تعارف پیش کیا گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ علامہ کی تقریباً ہر تصنیف کا ترجمہ عمل میں آیا ہے، یہ اردو تصانیف کے عالمی تراجم ہیں۔ یہ اعزاز مولانا محترم کے توسط سے اردو کو حاصل

ہوا ہے، اس افتخار کے لئے دنیائے لسانِ اردو علامہ شبلی کی مرہون نظر ہے، شبلی واقبال کے علاوہ کسی دوسرے اہل قلم کو یہ سعادت نہ مل سکی، الفاروق کا ترکی، فارسی، انگریزی، عربی، ملیالم، تراجم کا شان شکوہ اردو اسلوب وآہنگ کی ہی بازگشت سے معمور ہے۔ سیرۃ النبیؐ اور شعرالعجم کے تراجم تو دنیائے دانش کے استعجاب ہیں، ڈاکٹر محمد الیاس تبریک وتہنیت کے حقدار ہیں کہ انھوں نے ہمیں علامہ سے متعلق وافر معلومات فراہم کیں اور دامن علم کو آگہی بخشی۔

اس کتاب میں مختلف عنوانات کے وسیلے سے شبلی کے فکری اسالیب کی بازیافت ایک عمومی مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے اور شبلی شناسی کی تشویق پیدا کرتی ہے، راقم کے خیال میں ہر تحریر اور ہر تخاطب کا ماحصل قاری کو اصل متن کی قرأت کے لئے آمادہ کرلینا ہی تقریظ وتنقید کا اعجاز ہے، یہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے ہنر کا عرض ہے اور جوہر بھی کہ ان کی ان تحریروں سے شبلی کے مزید مطالعے کا جذبہ درونِ دل انگڑائیاں لیتا ہے، بعدازاں علامہ کی تحریر کا طلسم قارئین کو جگر گدازی کے اسرار سے آشنا کرتا ہے، شبلی کے قلم کی ساحری اور دلنوازی سے بے نیازی ممکن نہیں ہے، سوسال گزرنے کے باوجود شبلی کے اسالیب بیان کی پیروی ناموس ادب کی پہچان بنی ہوئی ہے، ہم شکر گزار ہیں کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے شائقین شبلی کے لئے ایک کشادہ راہ ہموار کی ہے اور علامہ کو نئے اندازِ نظر سے پرکھنے میں ہماری رہبری کی ہے، عصر حاضر میں شبلی کی بازآفرینی کے لئے ایک نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا ہے، اور شبلی کے افکار کی تشکیل وترتیب نو کی طرف ذی فکر اہل قلم کی توجہ نے ہماری حیرت فزائی میں اضافہ کیا ہے، پوری صدی شبلی واقبال کے تصورات اور تبحر سے فیضان حاصل کرتی رہی ہے، یہ نئی صدی ہی نہیں بلکہ طلوع صبح محشر تک شبلی کے صدق وصفا کی یہ گزرگاہ ہماری کامرانیوں کی نشاندہی کے لئے کافی ہے، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے حسب سعادت اس شاہراہ سے گزرتے ہوئے کچھ سنگریزے سمیٹنے کی کوشش کی ہے، ہم اس سعی کی ثمر آوری کے لئے دست بہ دعا ہیں ع:

فلک نشیں صفت مہر ہو زمانے میں

عبدالحق

۲۵ رمئی ۲۰۰۸ء

سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

حرفِ چند

لاریب اردو زبان و ادب کی طویل جگمگاتی تاریخ میں علامہ شبلی جیسی جامع الکمالات، متنوع الصفات اور ہمہ جہت شخصیت کی نظیر یکسر مفقود ہے، وہ بیک وقت ایک عظیم عالم و مفکر بھی تھے، مایہ ناز مؤرخ و متکلم بھی اور بلند پایہ ادیب و نقاد بھی، اور سب سے زیادہ وہ ایک ایسے رعنا اور سدابہار اسلوب نگارش کے بانی تھے جس کے تتبع کو ہر اہل قلم تادم حاضر سربلندی کے ساتھ اپنے مفاخر میں شمار کرتا ہے، بلاشبہ ان کے جدت اسلوب اور ندرت تحقیق نے محدود خیالات کو وسعتِ افلاک عطا کی ہے، عاجز کی اس رائے میں شمہ برابر مبالغہ نہیں ہے کہ شبلی کے شاداں و رقصاں اسلوب تحریر اور سخن سنجی کا سایہ بھی کسی پر پڑ جائے تو وہ آسمان ادب کا تارا بن جائے گا، واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی فطرت میں جو شاعرانہ تخیل آرائی اور جمال پسندی تھی اس کی صریر خامہ ان کی نثری تحریروں میں صاف سنائی دیتی ہے۔

شبلی کے نقد و نظر کا کمال اور شاعرانہ ذوق کی بہار دیکھنی ہو تو شعر العجم کا مطالعہ کریں اس منفرد تصنیف نے اردو ادب کی آبرو بڑھائی اور اس کو رشک ثریا عروج عطا کیا ہے، اس کتاب کے اسلوب کی شگفتگی اور رعنائی نے پندرہ سو صفحات کے مطالعہ کو ''گلگشت مصلا'' اور ''آب رکناباد'' بنا کر رکھ دیا ہے۔

اسی باعث شبلی کا شمار ہماری ادبی تاریخ کے ان ابطال اور اعیان رجال میں ہوتا ہے جن کے فن و شخصیت پر ریسرچ و تحقیق کا کارواں مسلسل رواں دواں ہے، اور مقام صد مسرت ہے کہ عزیز مکرم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے بھی ''متعلقات شبلی'' تالیف کر کے ذخیرہ شبلیات میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے، یہ کتاب دراصل موصوف عزیز کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کے معیاری رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہوئے، ان میں بعض مضامین بلاشبہ فکر و نظر کے نئے زاویے روشن کرتے ہیں، عاجز بے مایہ کو یقین کامل ہے کہ عزیز موصوف کے دیگر ادبی اکتسابات کی طرح پیش نظر کتاب کی عطر بیزی بھی وقف عام ہوگی۔ وماذلک علی اللہ بعزیز۔

(ڈاکٹر) محمد نعیم صدیقی ندوی

مقدمہ

''متعلقات شبلی'' ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے تحقیقی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، مشمولہ مضامین میں ایسے بھی ہیں جن میں علامہ شبلی کے علمی منصوبوں کی معنویت اور موصوف کی مدیرانہ صلاحیت کو اجاگر کرنے کے علاوہ اردو زبان وادب کے ارتقاء میں ان کی حصہ داری پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے بھی جن میں علامہ شبلی کی تاریخی ادبی تصنیفات مثلاً ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر''، ''موازنۂ انیس ودبیر'' اور شبلی کے جانشین وسوانح نگار علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف ''حیاتِ شبلی'' پر اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے علامہ شبلی نے تاریخ اور تاریخی مباحث پر جو کچھ لکھا ہے وہ لکھا ہی ہے، ان کی ایسی تحریروں میں بھی جن کا تعلق تاریخ سے نہیں ہے، تاریخی شعور اسی طرح گردش کرتا ہے جس طرح انسانی جسم میں خون، ڈاکٹر اعظمی نے ایک مضمون میں ان کی مورخانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض ایسے حقائق پیش کئے ہیں جو کم لوگوں کے علم میں تھے، ایک مضمون کا عنوان ''تذکرۂ گلشن ہند اور علامہ شبلی'' ہے جس میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ علامہ شبلی نے مشاہیر شعرائے اردو کے ایک قدیم تذکرے ''تذکرہ گلشن ہند'' کی تصحیح وتدوین کا جو اصول وطریقۂ کار متعین کیا تھا بعد میں وہی اصول وطریقۂ کار قدیم تذکروں اور نادر کتابوں کی تدوین وتصحیح کے صحتمند رجحان کی تقویت ومقبولیت کا باعث بنا، سرسید وشبلی کی رفاقت اور پھر شبلی کی علی گڑھ سے علاحدگی پر حاشیہ آرائی ہوتی رہی ہے، اس مجموعے میں اس موضوع پر بھی ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''علامہ شبلی علی گڑھ میں'' لیکن اس مضمون میں تنازعات سے

دامن بچاتے ہوئے ساری توجہ اس پر صرف کی گئی ہے کہ علی گڑھ میں علامہ شبلی نے کیا علمی کارنامے انجام دیے، علامہ شبلی کی تصنیفات اور تراجم کے عمومی تعارف اور عالم اسلام میں ان کی قدر دانی پر بھی ایک ایک مضمون اس کتاب میں شامل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مضامین ہی کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ شبلی کی شخصیت عالمی شخصیت تھی اور ان کی تصنیفات کی اہمیت کو کسی خاص خطۂ ارض، زبان یا عہد تک محدود نہیں کیا جا سکتا، عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شخصیت کو منور کرنے کے علاوہ ان کی تصنیفات کے حروف کو بھی اتنا روشن کر دیا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی آب وتاب میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

الیاس اعظمی نے ایک مضمون میں اس پاکیزہ موضوع کا بھی احاطہ کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف کی سیرت وشخصیت کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس کو نظر انداز کیا گیا تھا، مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی کتاب ''متعلقات شبلی'' اگرچہ مختلف موقعوں پر الگ الگ موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اس مجموعے کا بنیادی مقصد سیرت نگار، مورخ، متکلم، محقق، تنقید نگار، مدیر، منتظم، شاعر اور انشاء پرداز علامہ شبلی کی روشن شبیہ کو داغدار کرنے کی شعوری کوشش کرنے یا علمی اختلاف اور ذاتی عناد کی حد فاصل کو پامال کرنے والوں کو حقیقت سے روشناس کرانا ہے۔

ممکن ہے ڈاکٹر الیاس پر وہی الزام عائد کیا جائے جو علامہ شبلی نے ''حیات جاوید'' کے مصنف پر، آل احمد سرور اور رشید احمد صدیقی نے ''حیات شبلی'' کے مصنف پر عائد کیا تھا یعنی ''مدلل مداحی'' کا الزام۔ لیکن اس الزام سے کیا اس حقیقت کی ان دیکھی کی جا سکتی ہے کہ تحقیق وتنقید میں اگرچہ کوئی حرف، حرف آخر نہیں ہوتا شبلی کی تحقیق وتنقید بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن تحقیق وتنقید کے نام پر شبلی کی ذات اور تصنیفات پر الزامات عائد کرنے والوں میں سے بعض نے جو غیر سنجیدہ، غیر علمی روش اختیار کی ہے وہ بھی دائرۂ بحث سے باہر نہیں ہے، اس پس منظر میں ڈاکٹر الیاس کا یہ مجموعۂ مضامین یا کتاب ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہے۔

شبلی کی تصانیف پر اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں بھی ''سیرۃ النبیؐ''

کے بعض اندراجات کی بنا پر مخالفت کا جو طوفان اٹھا تھا اس سے بھوپال کی گرانٹ ہی بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی عظیم الشان خدمات اور تمام تر علمی ادبی فتوحات کے باوجود وہ تکفیر کے فتووں کا بھی سامنا کر چکے تھے مگر ان سب کے باوجود شبلی کی عظمت اور ''سیرۃ النبیؐ'' کی بلند پایہ علمی تاریخی حیثیت کا کون منکر ہو سکتا ہے۔ ''اورنگ زیب عالمگیر'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' پر مسلسل کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا ہے لیکن جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے ان میں بشمبھر ناتھ پانڈے اور ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد کی تصانیف کی صورت میں شبلی کے موقف کی تائید بھی ہوتی رہی ہے۔ اگر یہ ضروری ہے کہ بحیثیت مورخ شبلی کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جائے یا تاریخ نگاری کے اصولوں کی بنیاد پر اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں شبلی کے موقف کو پرکھنے کی کوشش کی جائے تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے بارے میں شبلی کے موقف کارد کرنے والوں کے پیش کردہ ماخذ اور طرز استدلال کو بھی انہی اصولوں پر پرکھا جائے؟

''موازنہ انیس و دبیر'' شبلی کی اہم ادبی تنقیدی تصنیف ہے، تمام اردو والوں کو شبلی کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ شبلی کی اس کتاب سے مرثیے کی صنف کو نہ صرف ادب میں باوقار حیثیت حاصل ہوئی بلکہ تقابلی مطالعے کا بھی آغاز ہوا، مگر ہو یہ رہا ہے کہ شبلی کی اس کتاب کو ہی نہیں ان کی شخصیت کو بھی ہدف ملامت بنایا جا رہا ہے۔ تقی عابدی نے ایک سمینار میں کہا تھا کہ:

> ''جی ہاں اور کتابیں موازنہ کی رد میں لکھی گئیں، ایک کتاب ہے ''ردالموازنہ'' فضل علی کی جو تقریباً ساٹھ، ستر صفحے کا کتابچہ ہے، اگر آپ چاہیں تو فوٹو کاپی آپ کو بھیج دوں گا، دوسری کتاب ''المیزان'' ہے جو ساڑھے چھ سو صفحے کی ہے، لیکن مسئلہ یہی ہوا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا نہیں گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اکیس بائیس صفحے میں مولانا شبلی نعمانی نے اس معرکہ میں جو حملے کیے ہیں اس کا ''المیزان'' کے چھ سو صفحات میں بھی صحیح طریقے سے جواب نہیں دیا گیا ہے۔'' (انیس و دبیر، ص ۳۰۲)

عالمی سمینار میں ''اینٹ کا جواب پتھر'' سے دینے جیسی زبان کے استعمال سے ''دل کا

بغض'' ہی نہیں '' شکست خوردگی'' کا احساس بھی عیاں ہوتا ہے۔اس کے جواب میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ ابھی تک '' موازنہ انیس ودبیر'' کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکا تو آئندہ کیا دیا جاسکے گا؟ یا یہ کہ سچ کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا۔

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی اس سچائی کا اعتراف موجود ہے جس کو جھٹلانے کی منظم کوشش کی جاتی رہی ہے۔دوسروں نے بھی بار بار یہ سچائی دوہرائی ہے کہ '' موازنہ انیس ودبیر'' کو مسترد نہیں کیا جاسکتا، یہ شبلی کی تنقیدی بصیرت کا شاہکار ہے، مثلاً پروفیسر گوپی چند نارنگ کا اسی سمینار میں کہا ہوا یہ جملہ بھی اسی کتاب میں درج ہے جس میں '' اینٹ کا جواب پتھر سے'' نہ دینے پر یاس وحسرت میں ڈوبا ہوا تقی عابدی کا بیان درج ہے:

'' کبھی کبھی کوئی مدلل تنقید اگر غلط حقائق پر مبنی ہے تو وہ بھی گمراہ کرتی ہے، ایک مدت تک یہ بات سمجھی جاتی رہی کہ '' موازنہ انیس ودبیر'' سے بہتر مرثیے کا کسی نے جائزہ نہیں لیا ہے، حالی نے بھی نہیں لیا، اس کے رد میں کتابیں لکھی گئیں، گویا تنقید سے اگر کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو ان کو صحیح کرنے کی کوشش بھی تنقید کے ذریعے ہوتی ہے، جیسے المیزان، ردالموازنہ، لیکن شاید مجھ سے کوتاہی سرزد نہ ہوگی اگر میں کہوں کہ ان دونوں کتابوں کے باوجود موازنہ کا دبدبا اردو تنقید کی روایت پر برابر رہا جو شبلی نے کہہ دیا وہ سکۂ رائج الوقت ہوگیا۔''

(انیس ودبیر، ص ۳۳۵)

مجموعی طور پر شبلی اور نگارشات شبلی کا مطالعہ کرنے والوں نے جو رائے قائم کی ہے اس سے شبلی کی علمی شخصیت کافی نمایاں صورت میں سامنے آچکی ہے۔شیخ محمد اکرام نے بہت پہلے لکھا تھا:

'' ہماری قومی زندگی میں مجموعی طور پر ان (سرسید) کا جو مقام ہے، وہ کسی اور کا نہیں ہوسکتا، لیکن اس سے علامہ شبلی کی عظمت میں کمی نہیں ہوتی، وہ سولہ برس سرسید کے رفیق کار رہے اور انھیں سرسید کا ہاتھ بٹانے اور ان سے مستفید

ہونے کے غیر معمولی مواقع ملے، لیکن قومی تاریخ میں ان کی حیثیت ثانوی نہیں، انھوں نے کام کو آگے بڑھایا، اس کی بنیادیں مستحکم کیں اور کئی منزلوں میں سرسید سے آگے نکل گئے۔

اب علم و فضل کے میدان میں علامہ شبلی کی برتری ظاہر ہے لیکن قوم کی فکری تاریخ میں بھی ان کا مرتبہ کسی سے کم نہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے ''شبلی کی بات سرسید کی بات سے زیادہ مختلف نہیں تھی، مضمون کا فرق کم ہے، لب ولہجہ کا فرق زیادہ ہے۔'' لیکن جیسا کہ انھوں نے آگے چل کر وضاحت کی ہے، معاملہ صرف لب ولہجہ کا نہیں، بنیادی پالیسی اور طریق کار کا بھی ہے۔ ''شبلی قدیم روایات کے پاسدار اور قومی مزاج کے شناسا تھے'' انھیں جدید تقاضوں کا احساس تھا۔ وہ علم الکلام کو نئے سرے سے ترتیب دینا چاہتے ہیں لیکن انھیں اس پر اصرار ہے کہ ''بزرگان سلف کے مقرر کردہ اصول کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے۔'' شبلی صحیح معنوں میں ذوجہتین تھے، وہ نہ صرف علی گڑھ تحریک کے ''رکن رکین'' تھے بلکہ جب ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کا پہلا باقاعدہ اجلاس ہوا تو اس کے بھی ''جزو غالب'' ہو گئے، وہ جدید گروہ اور علماء، دونوں کا نقطۂ نظر جانتے تھے، اور بیچ کی راہ اختیار کر سکتے تھے۔

شبلی کے معتدل طریقہ کار کا یہ نتیجہ ہوا کہ اگر چہ بعض مسائل پر انھوں نے بالآخر سکوت ہی مناسب سمجھا لیکن انھوں نے جو لکھا، اس کے بیشتر حصے کو قبول کا درجہ حاصل ہوا اور ان کی بدولت نہ صرف جدید کی بعض باتیں قوم کی فکری زندگی کا جزو ہو گئیں بلکہ قدیم سے بھی تسلسل برقرار رہا۔'' (یادگار شبلی، ص ۱۶)

لیکن شبلی کے بارے میں ان کی رائے آج بھی اتنی ہی بامعنی ہے جتنی پہلے تھی۔

سلاست ومتانت ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی تحریروں کی روح ہے۔ متعلقات شبلی میں شامل ان کے مضامین میں اگر چہ بعض کی حیثیت جواب الجواب کی ہے اور بعض کی شبلی اور

دبستانِ شبلی کی ترجمانی کی، اس کے باوجود زبان و بیان کی سلاست اور لب و لہجے کی متانت پر کہیں حرف نہیں آیا ہے، میں اس کو شبلی اور دبستان شبلی کا ہی فیضان سمجھتا ہوں، ڈاکٹر الیاس، شبلی، نگارشاتِ شبلی دبستانِ شبلی اور دارالمصنفین پر نہ صرف مسلسل لکھ رہے ہیں بلکہ بہت اچھا لکھ رہے ہیں، دارالمصنفین کی تاریخی خدمات کے بارے میں ان کی جو کتاب خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) نے شائع کی ہے اس میں بہت اہم معلومات جمع ہوگئی ہیں۔ امید ہے کہ علمی حلقے میں ان کی یہ کتاب بھی مقبول ہوگی، یہ کتاب شبلی شناسی کا ایک اہم دریچہ ہے۔

شمیم طارق
فلیٹ نمبر ۷ ۲، مرزبان منش، بائیکلہ
فروٹ مارکیٹ، ممبئی۔ ۷ ۲

منظوم تاثرات

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی ☆

"متعلقات شبلی" ہے اک گنج شائگاں
الیاس اعظمی کا جو ہے نقش جاوداں
شبلی کے طرز خاص کا ہے اس میں تذکرہ
اوران کے فکروفن کے محاسن کا ہے بیاں
گلہائے رنگا رنگ کا گلدستۂ حسیں
ہے یہ کتاب شبلی شناسی کی داستاں
شبلی کے کارناموں کا کوئی نہیں جواب
سارے جہاں میں پھیلے ہیں شبلی کے قدرداں
شبلی جہان شعر و ادب میں وہ نام ہے
جس کے بغیر ادھوری ہے اردو کی داستاں
ان ناقدین شبلی کا اس میں جواب ہے
بے وجہ جو اٹھاتے ہیں شبلی پہ انگلیاں
حاصل ہو اس کتاب کو برقی قبول عام
پہنچے وہاں پہ رہتے ہیں اہل نظر جہاں

☆☆☆

☆ رئیس بخش فارسی آل انڈیا ریڈیو۔نئی دہلی

دیباچہ

علامہ شبلی کی شخصیت کا ایک نمایاں باب یہ ہے کہ وہ جہاں رہے صف اول میں ممتاز رہے اور جس موضوع پر قلم اٹھایا نہ صرف اس کا حق ادا کر دیا بلکہ انفرادیت کا نقش بھی قائم کر دیا، یہی وجہ ہے کہ اردو کے عناصر اربعہ خاص طور سے سر سید احمد خاں نے ابتدا ہی میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا، دراصل شبلی شناسی کا آغاز سر سید سے ہوتا ہے پھر مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، مولوی عبدالحلیم شرر اور دیگر معاصرین نے علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے جاوداں کارناموں کی عظمت کا اعتراف کیا، عہد سر سید سے اب تک علامہ شبلی اذہان وقلوب پر چھائے ہوئے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے افکار وخیالات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے، اس کے باوجود یہ کہنے میں تامل نہیں کہ علامہ شبلی کے فکر وفلسفے کو سمجھنے کے لئے جس قدر کام ہونا چاہئے تھا نہیں ہوا، ایک صدی کے عرصے میں تقریباً دو درجن کتابیں، چار سو کے قریب مضامین ومقالات اور آٹھ رسائل کے خصوصی شمارے شبلی شناسی کی کل یہی کائنات ہے۔

اردو میں شخصی لحاظ سے غالب واقبال اہل قلم کی خاص توجہ کے مستحق ٹھہرے اور بلاشبہ غالب واقبال ہمارے ادب کی آبرو ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ ان کے کمالات کا دائرہ شعروادب سے آگے نہیں بڑھتا؛ جبکہ علامہ شبلی کی شخصیت میں بڑا تنوع اور بڑی بوقلمونی ہے، ہماری تاریخ، علوم وفنون اور شعروادب کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جہاں علامہ شبلی کے فکر ونظر کی جلوہ سامانی ہماری آنکھوں کو خیرہ نہ کرتی ہو۔

اسی احساس کے پیش نظر راقم نے مطالعہ شبلی کو اپنا موضوع تحقیق وتحریر قرار دیا اور کئی علمی وتحقیقی منصوبے بنائے جس میں بعض تکمیل کے مراحل میں ہیں اور کچھ کے لئے مزید وقت

درکار ہے، جو ان شاء اللہ آئندہ شائع ہوں گے۔

''متعلقات شبلی'' میری مستقبل تصنیف نہیں؛ بلکہ یہ میرے ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور بعض سیمناروں میں پڑھے گئے، جسے اہل علم نے سراہا اور مفید قرار دیا۔ دو جوابی مضامین ہیں جس میں علامہ شبلی کے تعلق سے بعض غلط فہمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور علامہ شبلی کے موقف کی صداقت واضح کی گئی ہے، مجموعی طور سے علامہ کی شخصیت، تصانیف اور ان کے افکار و خیالات کا ایک جامع مرقع اس میں آ گیا ہے۔

اردو میں متنی تحقیق کے آغاز کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے، تذکرہ گلشن ہند کی تصحیح و تحقیق اور تدوین سے علامہ شبلی نے اس کی داغ بیل ڈالی، ایک مفصل مضمون میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے، بدقسمتی سے شبلی کا یہ کام بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ہاتھ لگا جنھوں نے اس کی افادیت کم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، افسوس کہ حیات شبلی بھی اس کے ذکر سے خالی ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا تھا کہ ''مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے اور کچھ مدت کے بعد وہ صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔'' لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ ان کی یہ رائے قطعی غلط تھی، علامہ شبلی کی تصانیف کا سکہ عرب وعجم میں یکساں چلا اور ان کی بیش تر کتابوں کا انگریزی، عربی، فارسی، پشتو، ترکی حتی کہ کنڑ اور ملیالم میں بھی ترجمہ ہوا اور وہ دنیا بھر میں پڑھی گئیں اور آئندہ بھی پڑھی جاتی رہیں گی، دراصل شبلی عالمی ادیب و انشا پرداز تھے، ایک مضمون میں ان کی تصانیف کے تراجم کا جائزہ و تعارف، اور دوسرے مضمون میں عالم اسلام میں شبلی کی عظمت و شہرت اور اعتراف کمال کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں کتاب کا آغاز شبلی کے عشق رسولؐ اور خاتمہ ان کے عزائم اور منصوبوں کی معنویت کے ذکر پر ہوا ہے، یقیناً اس سے شبلی شناسی میں مدد ملے گی۔

یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ مجموعہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے، اگر اس میں کسی قسم کے اعتدال و توازن کی کمی محسوس ہو اور اس کی نشاندہی کی جائے تو راقم اس کے لئے احسان مند رہے گا۔

علامہ شبلی سے متعلق میری تحریروں کے سب سے بڑے مداح دارالمصنفین کے سابق ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم تھے، اسی تعلق سے انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم جلد چہارم کی تصحیح و تحقیق کی ذمہ داری سونپی اور پھر انھیں دارالمصنفین سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ان کی ناگہانی موت سے علم و ادب کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اس کا اثر براہ راست مجھ پر پڑا ہے، حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کے بعد انھیں کی ذات میرا سہارا تھی، افسوس کہ میں اپنے بڑے محسن و مربی اور علمی سرپرست سے محروم ہوگیا، اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کی میری فرمائش انھوں نے قبول کرلی تھی مگر یہ مقدر نہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ ان کی وفات سے اس کتاب کی اشاعت کا حوصلہ ہی جاتا رہا تھا، اللہ تعالیٰ گرامی قدر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی صاحب کا سایہ شفقت دراز فرمائے کہ انھوں نے ایسے وقت میں حوصلہ دیا، ہمت بندھائی اور اس کی اشاعت پر مصر رہے، اس محبت فراواں کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

گرامی قدر پروفیسر عبدالحق صاحب کی مسلسل حوصلہ افزائی، دعائیں، استاذی ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی اور برادر مکرم مولانا عمیر الصدیق ندوی کی محبت، قیمتی اور مفید مشورے اور برادر سلیم جاوید ناظر کتب خانہ دارالمصنفین کا تعاون شامل حال نہ ہوتا تو کتاب کی اشاعت جلد ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سلامت رکھے۔ استاذی پروفیسر عبدالحق صاحب اور جناب شمیم طارق صاحب کا خاص طور سے ممنون احسان ہوں کہ انھوں نے تبریک و مقدمہ سے کتاب کے وقار میں اضافہ کیا، اللہ تعالیٰ اس کوشش کو شرف قبولیت بخشے۔

مخلص

محمد الیاس الاعظمی

(سکریٹری)

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

مورخہ

۲۱ر جولائی ۲۰۰۸ء

بروز دوشنبہ

علامہ شبلی - ایک عاشق رسول ﷺ

علامہ شبلی کی تعلیم وتربیت قدیم مذاق کے مطابق چٹائیوں پر ہوئی تھی، درسیات کی تکمیل بالخصوص علوم دینیہ قرآن وحدیث، تفسیر وغیرہ میں بڑی تگ ودو کی، اپنے عہد کے علوم دینیہ کے ماہرین کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا، مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا ارشاد حسین رام پوری اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے دامن تربیت میں ان کا مذہبی شعور اس قدر پختہ ہوا کہ حالات کے تمام سرد وگرم کے باوجود انھوں نے اپنی مذہبی حیثیت کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھا، ان کی تمام تر علمی وتصنیفی کوششیں محض اسلام کے بقاء وتحفظ اور اس کی سربلندی کے لئے تھی اور جس طرح انھیں اپنا مذہب عزیز تھا اسی طرح وہ اپنے رسولؐ کے بھی ابتداء ہی سے بڑے عاشق وشیدائی تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے درست لکھا ہے کہ اس نام نامیؐ کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد پایاں نہ تھی۔(۱) واقعہ یہ ہے کہ وہ حب نبویؐ سے ہمیشہ سرشار رہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور جب روضۂ اطہر پر پہنچے تو ان کا والہانہ عشق نبویؐ ایک مثنوی کی شکل میں ظاہر ہوا، چنانچہ انھوں نے خود روضۂ اقدس پر وہ مثنوی پیش کی، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

اے بہ کرم کار جہاں کرد ساز — مرہمہ را پیش تو روے نیاز

چو بہ درت آمدہ ام با امید — از کرم خویش مکن نا امید

چوں بہ درت آمدم امیدوار — سایہ لطفے ز سرم بر مدار (۲)

۱۸۸۳ء میں جب وہ علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو وہاں انھیں مذہبی روح نظر نہیں

آئی، چنانچہ انھوں نے اس کمی کو اس طرح دور کرنے کی کوشش کی کہ کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، جس میں سیرت نبویؐ کے کسی پہلو پر وہ خود تقریر کرتے، میلاد کے یہ جلسے ابتداءً اپنے بنگلے پر کرتے رہے پھر سیرت کا ایک بڑا جلسہ شان وشوکت کے ساتھ سالار منزل میں کیا اور پھر یہ جلسے اہتمام کے ساتھ اسٹریچی ہال میں ہونے لگے۔

طلبائے علی گڑھ میں سیرت نبویؐ کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے انھوں نے سیرت نبویؐ پر عربی میں ایک رسالہ تاریخ بدء الاسلام لکھا جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہا اور بقول ڈاکٹر انور خالد محمود ''اس رسالہ نے نہ صرف طلبہ کے دلوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عقیدت ومحبت کے جذبات پیدا کئے بلکہ خود مصنف کے دل میں عشق رسول کی قندیل روشن کردی (۲)

عشق رسول کی یہ لے سیرۃ النعمان کے منظوم دیباچے میں حد انتہا کو پہنچ گئی۔

شیفتگانیم و پیمبر پرست ☆ سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست

علی گڑھ میں انھوں نے نامورانِ اسلام کے حالات وسوانح قلم بند کرنے کا منصوبہ بنایا اور المامون، سیرۃ النعمان اور الفاروق جیسی معرکہ آراء کتابیں لکھیں، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے نامورانِ اسلام کا آغاز کیا تو بارہا ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور (ﷺ) کا نام آنا چاہئے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا۔ (۳) مگر یہ ایک ایسا نازک اور اہم فریضہ تھا کہ علامہ شبلی عرصہ تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ (۴) ان کا خیال تھا کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے اعلیٰ معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔ (۵)

علی گڑھ کے بعد علامہ شبلی حیدر آباد کے سررشتہ علوم وفنون سے وابستہ ہوئے تو سلسلہ کلامیہ کے ساتھ سیرت نبویؐ کی تالیف کا عزم اور مضبوط ہوا، چنانچہ یہیں انھوں نے سیرت نبوی لکھنا چاہا مگر بوجوہ نہ لکھ سکے، ان کی نگاہ میں سیرت نبوی کی تالیف وتدوین کا معیار بہت بلند تھا، فرماتے تھے کہ سوانح عمری ایسی لکھنی چاہئے جس سے صاحب سوانح کا پایا اونچا

نظر آئے، لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔ (٦)

سلسلہ کلامیہ کے بعد شعر العجم کا سلسلہ شروع ہوا اور نامورانِ فارس کے بلند ادبی و شعری محاسن بیان کرنے کے دوران شبلی کا رہوار قلم آستانۂ نبوت پر جا پہنچا اور شعر العجم تشنۂ تکمیل چھوڑ کر وہ دربارِ رسالت میں اس طرح حاضر ہوئے کہ پھر دمِ واپسیں تک اس سے جدا نہ ہوئے، ان کے عشقِ رسول کا اندازہ تدوینِ سیرت سے متعلق ان کے اس عزم سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔'' (۷) ان کا عشقِ رسول اس درجہ پر پہنچ گیا تھا کہ وہ سیرتِ رسول کو مجموعۂ ضروریاتِ دینی و دنیوی خیال کرتے تھے، لکھتے ہیں:

> ''یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعۂ ضروریاتِ دینی و دنیوی ہے۔'' (۸)

شبلی عاشقِ رسول کے وفورِ جذبات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں یہ جذبہ پروان چڑھا کہ خدمتِ سیرت ہی میں وہ جان جان آفریں کے سپرد کردیں، اسے انھوں نے خاتمہ بالخیر قرار دیا ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چند مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرتِ نبوی کی تصنیف و تالیف میں وہ مصروف ہوئے اور سیرت کی کتابوں کا مطالعہ

وجائزہ لینا شروع کیا تو شبلی کا عشق نبویؐ پختہ سے پختہ تر اور دل ودماغ میں جاگزیں ہو گیا اور ان پر عالم وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، اس حال میں انھوں نے فرمایا۔

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالم
دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی
کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

ہمارے نقادوں نے شبلی کو نعت نگاروں میں شامل نہیں کیا ہے، لیکن یہ قطعہ ان کی بلند نعت گوئی کا بہترین مظہر ہے، اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے نعتیہ ادب میں اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے، تو غالباً مبالغہ نہ ہوگا۔

اخیر دور میں انھوں نے متعدد مذہبی اور اخلاقی نظمیں لکھیں اس میں کئی نظموں کا تعلق نعتیہ شاعری سے ہے، ہجرت نبویؐ، تعمیر مسجد نبویؐ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم اور عفو وغیرہ نظمیں نہ صرف ان کی نعتیہ شاعری کا نمونہ ہیں بلکہ ایک عاشق رسول کے دلی جذبات واحساسات کا آئینہ بھی ہیں، ہجرت نبویؐ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انصار پاک اور مہاجر تھے جس قدر — مزدور بن گئے کہ خدا کا یہ کام تھا
اک اور نفس پاک بھی ان سب کا تھا شریک — جو آب وگل کے شغل میں بھی شاد کام تھا
کندھوں پہ اپنے لاد کے لاتا تھا سنگ وخشت — سینہ غبار خاک سے سب گرد فام تھا
سمجھے کچھ آپ کون تھا ان کا شریک حال — یہ خود وجود پاک رسول انامؐ تھا
جو وجہ آفرینش افلاک وعرش ہے — جس کا کہ جبرئیل بھی ادنیٰ غلام تھا
صلوا علی النبی واصحابہ الکرام — اس نظم مختصر کا یہ مسک ختام تھا

ان کی دوسری تاریخی نظم جس میں انھوں نے ہجرت کے واقعہ کی منظر کشی کی ہے، اس کے ایک ایک حرف سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس سے ان کی والہانہ شیفتگی ظاہر ہوتی ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

علامہ شبلی مدۃ العمر مخالفین اسلام کا جواب دیتے رہے، وہ اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن پر بے جا اعتراضات برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور جب انھوں نے سیرت پر یورپ کے مصنفین کی کتابیں دیکھیں جس میں انھوں نے ذات اقدس کو ہدف تنقید وتنقیص بنایا تھا تو انھیں سخت تکلیف پہنچی، چنانچہ انھوں نے یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں کی سختی سے تردید کی اور سیرت نبویؐ کا صاف وشفاف آئینہ دکھلایا کہ تمام نفوس قدسیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سب سے متبرک اور بابرکت ہے۔

ان کا خیال تھا کہ سیرت کی ضرورت صرف مسلمانوں کو نہیں تمام عالم کو اس کی ضرورت ہے۔(۹) یہی وجہ ہے کہ وہ سیرت کو انگریزی میں شائع کرنے کے خواہاں تھے تاکہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔(۱۰)

ان مقاصد اور خمار عشق نبویؐ میں انھوں نے سیرۃ النبی کا آغاز کیا اور انتہائی بلند معیار پر سیرۃ النبی قلمبند کی اور جب ولادت نبویؐ کے مقام پر پہنچے تو شبلی کا عشق رسول حد انتہا کو پہنچ گیا، اس موقع پر انھوں نے ایسی لافانی تحریر سپرد قلم کی جس کی مثال عالمی ادب میں ملنی مشکل ہے:

> ''چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضاوقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں ابروباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید براہیم، جمال یوسف، معجزہ طرازی موسوی، جاں نوازیٔ مسیح سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارض شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی فرخ بال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتش کدۂ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر، آزر کدہ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔'' (۱۱)

اسی سرمستی اور جذب وشوق میں وہ سیرۃ النبی لکھ رہے تھے کہ ان کا وقت موعود آپہنچا اور ایک عاشق رسول سیرت سیرت کہتے ہوئے اپنے مالک حقیقی کے حضور جا پہنچا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس طرح شبلی کے منہ سے جو آخری کلمات نکلے وہ بھی حب نبوی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

سیرت النبیؐ دراصل علامہ شبلی کے عشق رسول کا نمونہ اور نذرانۂ عقیدت ہے، اس کا اندازہ سیرت النبیؐ کے سرنامہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

''ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔

ز چشم آستیں بردار وگوہر را تماشا کن

(شبلی)

حوالے

(۱) حیات شبلی، ص ۱۰۷

(۲) ایضاً ص ۹۲

(۳) اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۵۳۸

(۴) حیات شبلی، ص ۲۰۷

(۵) سیرت النبیؐ ج ۱ مقدمہ ص ۴

(۶) مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۳

(۷) حیات شبلی ص ۲۰۳

(۸) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۴۲

(۹) سیرت النبیؐ ج ۱ مقدمہ ص ۴

(۱۰) ایضاً ج ۱ مقدمہ ص ۱-۴

(۱۱) مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۶

(۱۲) سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۱۱۴



اردو زبان وادب کے ارتقا میں

علامہ شبلیؒ کا حصہ

علامہ شبلی کے ایک بڑے ناقد شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ ''قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا، وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔''(۱) زیر نظر مقالے میں اسی معجزے کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی جامع کمال شخص تھے ان کے کارناموں کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے، شعروادب، تاریخ وتذکرہ، سیرت وسوانح، تنقید وتحقیق، فلسفہ وکلام، تعلیم وتربیت، خطابت وسیاست غرض ان تمام موضوعات پر ان کی گراں قدر تحریریں ہیں، ان کے مفصل ذکر کے لئے ایک دفتر بے پایاں چاہئے، یہاں محض ان کے ان عظیم الشان کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے جس کی بدولت اردو زبان ذرہ سے آفتاب بن گئی۔

مقالہ نگاری

اردو میں مقالہ نگاری کی ابتداء سرسید مرحوم کا کارنامہ ہے، علامہ شبلی نے اسے مزید ترقی دی اور اسے ایک نیا اسلوب وانداز عطا کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خالص تاریخی مقالہ نگاری کی ابتداء کا سہرا علامہ شبلی ہی کے سر ہے، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، تراجم، حقوق الذمیین وغیرہ ان کے ایسے ہی معرکہ آرا تاریخی مقالات ہیں جن کا آوازہ شہرہ ہندوستان سے نکل کر عالم اسلام بلکہ یورپ تک پہونچا۔

علامہ شبلی نے مختلف النوع موضوعات پر بے شمار علمی وتحقیقی مقالات سپرد قلم کئے، جنھیں مولانا سید سلیمان ندوی نے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی اور فلسفیانہ وغیرہ

موضوعات کے لحاظ سے آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے، یہ مجموعہ مقالات اپنے اپنے موضوعات پر کسی بلند پایہ تصنیف سے کم رتبہ نہیں مثلاً جلد اول مذہبی علوم بالخصوص قرآنیات پر ان کی گہری نظر کا نمونہ ہے تو دوسری جلد ان کے ادبی وتنقیدی شعور کی غماض، اسی طرح تیسری جلد کے مضامین ماہر تعلیم ہونے کا ثبوت ہیں، ان کی تنقیدی بصیرت کے جلوے چوتھی جلد میں دیکھے جاسکتے ہیں، پانچویں اور چھٹی جلد تاریخی تحقیقات کا نمونہ ہے تو ساتویں جلد فلسفہ وکلام کے نادر معلومات کا خزانہ، آخری جلد ان کے افکار وخیالات بالخصوص قوم وملت کی دردمندی میں بنائے گئے منصوبوں اور خاکوں پر مشتمل ہے جس سے ملت کی ہمدردی اور اسلام کی سربلندی کے جذبات ابھرتے ہیں غرض کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے علامہ شبلی کے یہ مجموعہ مقالات بلاشبہ ذخیرہ اردو میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوانح نگاری

اردو میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز مولانا الطاف حسین حالی کی حیات سعدی سے ہوا۔ (٢) علامہ شبلی اس عہد کے دوسرے بڑے سوانح نگار ہیں جنھوں نے سلسلہ ناموران اسلام کے تحت متعدد سوانح عمریاں مثلاً المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم لکھیں اور سوانح نگاری کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا، الطاف فاطمہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ:

> "مولانا شبلی نعمانی کی روشن اور پر جلال شخصیت اس دور کی سوانح نگاری پر کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ان کے معاصرین کی نوشتہ سوانح عمریوں کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ گئی ہے۔" (٣)

علامہ شبلی کی سوانح عمریاں دو قسم کی ہیں: تاریخی اور غیر تاریخی ہیں، اردو میں تاریخی سوانح نگاری علامہ شبلی کا کارنامہ ہے، المامون اور الفاروق ان کی ایسی ہی عظیم الشان کاوشیں ہیں جو ذخیرہ ادب میں ان کا گراں قدر عطیہ ہیں، اردو کے سوانحی ادب کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہماری ادبی تاریخ اس کی دوسری مثال اب تک نہ پیش کر سکی۔

علامہ شبلی کی سوانح نگاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مولانا مجیب اللہ ندوی لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی کی سوانح نگاری اس حیثیت سے بھی اپنے معاصرین میں ممتاز ہے کہ وہ کسی واقعہ کو نہ تو صاحب سوانح کی عظمت وعقیدت کی وجہ سے مان لیتے ہیں اور نہ محض اس بنا پر اسے تسلیم کرتے ہیں کہ کسی تاریخ یا تذکرے میں خواہ وہ کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو اس کا ذکر ملتا ہے بلکہ وہ روایت کے ساتھ درایت سے بھی واقعہ کی جانچ پڑتال کرتے ہیں، اس کی وجہ سے بعض غلط فہمیاں بھی دور ہوجاتی ہیں۔ اور عقیدت کے غلو کا بھی سدباب ہوجاتا ہے۔'' (۴)

یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح عمریاں بے حد مقبول ہوئیں اور ان کے بے شمار ایڈیشن ملک وبیرون ملک سے شائع ہوئے، دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے، الفاروق کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیا کی متعدد زبانوں میں منتقل کی گئی۔

علامہ شبلی نے نہ صرف سوانح نگاری کی بلکہ سوانح نگاری کے اصول وآئین بھی منضبط کئے، جو حالی کے بعد خاص طور سے اردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے مثالی کارنامہ ہے۔

تاریخ نگاری

مہدی افادی نے علامہ شبلی کو تاریخ کا معلم اول قرار دیا ہے۔(۵) خود علامہ شبلی نے ابتدائے تصنیف وتالیف سے اپنی تصنیفات کا میدان تاریخ کو قرار دیا تھا(۶)، چنانچہ وہ مدۃ العمر تاریخ کی خدمت کرتے رہے اور اردو کو چند لازوال تاریخی کتابوں سے بہرہ ور کیا، المامون، الفاروق، سیرۃ النبیؐ اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر اور متعدد تاریخی مقالات ان کے قلم سے نکلے جو ان کے گہرے تاریخی شعور اور مورخانہ بصیرت کے نمونے ہیں جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے قابل فخر کاوشیں ہیں۔

علامہ شبلی اردو کے پہلے ایسے مورخ ہیں جنھوں نے ابن خلدون کے بعد اصول تاریخ

نگاری کی طرف توجہ دی اور اس کے اصول وضوابط وضع کیے، ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

> ''وہ صرف مورخ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضع ونقاد بھی تھے انھوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمائے پر جو تنقید کی ہے وہ بلاشائبہ مبالغہ اصول تاریخ کے لئے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے۔'' (۷)

علامہ شبلی نے نہ صرف اصول وضع کیے بلکہ عملی طور پر اپنی تاریخی تصنیفات میں ان کو برتنے کی بھی کوشش کی، بے شبہ اردو کے تاریخی ادب میں علامہ شبلی کی یہ کوشش سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تنقید نگاری

اردو شعراء کے قدیم تذکروں میں اگرچہ تنقید کے ابتدائی عناصر ملتے ہیں تاہم اردو میں فن تنقید کا باقاعدہ آغاز مولانا حالی کے مقدمہ شعروشاعری سے ہوا (۸)، علامہ شبلی کا شمار مولانا حالی کے ساتھ ان اولین تنقید نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فن تنقید کو آبروبخشی، عربی و فارسی تنقید پر بھرپور اور کسی قدر مغربی تنقید نگاری پر بھی ان کی نگاہ تھی اس سرمائے کا جائزہ لے کر انھوں نے ادبی اور عملی تنقید کے متعدد نمونے پیش کیے، موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم کی پانچ جلدیں ان کی تنقید نگاری کا بہترین نمونہ ہیں، تنقید میں ان کے مقام ومرتبہ کی تعیین کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ:

> ''شبلی کا مرتبہ نقاد کی حیثیت سے مسلم ہے، ان کی نظر میں وسعت اور گہرائی ہے، جدت اور اپج ہے اور ان کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں، تنقید اور ادبی تجزیے کے میدان میں وہ کسی سے کم اہمیت نہیں رکھتے تھے ان کے جمالیاتی ذوق کی بلندی ہر مشکل میں حسن احساس کی صلاحیت اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعے نے ان کو اس مرتبے پر پہونچا دیا ہے جس پر ان کے زمانے میں کوئی نہیں پہونچ سکا۔'' (۹)

ان کی تنقیدی کاوشوں خاص طور سے موازنہ انیس و دبیر پر بڑے اعتراضات ہوئے تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کے مخالفین اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے گرد کو بھی نہ پہونچ سکے، اور آج بھی موازنہ اور شعرالعجم کی تب وتاب میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں شعرالعجم جیسی کتاب لکھی ہی نہیں گئی۔

کلامی ادب

علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات اور ان کی متکلمانہ بصیرت کے نمونے ہیں، یہاں ان کی قدر و قیمت سے قطع نظر محض یہ عرض کرنا ہے کہ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں کلامی ادب کا آغاز کیا (۱۰)، صحیح یہ ہے کہ شبلی سے پہلے اور شبلی کے بعد اردو میں کوئی ایسا مصنف اور اہل قلم نظر نہیں آتا جس نے اس قدر خشک موضوع پر اپنی تمام تر ادبی رعنائیوں کے ساتھ علم الکلام پر چار اہم اور معرکہ آراء کتابیں لکھی ہوں، یقیناً یہ شبلی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔

فلسفہ وکلام پر اردو کے متعدد اہل قلم نے قلم اٹھایا اور بے شبہ انھوں نے بڑی کاوشیں کیں خاص طور سے سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی کی کوششیں کم اہم نہیں لیکن ان کی تحریروں میں محض علم کلام ہے کلامی ادب نہیں، یہ خوبی بھی شبلی کی قسمت کا حصہ ہے۔

فارسی ادب

فارسی شعروادب پر جس قدر باریک اور گہری نظر علامہ شبلی کی ہے ان کے معاصرین اس سے محروم ہیں، آزاد اور براؤن نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور اپنی اپنی بیش بہا کاوشیں پیش کیں تاہم وہ شبلی کے صحیفہ حسن وعشق شعرالعجم کے ہم پلہ بھی نہیں قرار دی جاسکتیں، حافظ محمود شیرانی کی تنقید شعرالعجم کے باوجود شعرالعجم نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ ایک صدی بعد بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور آج تک خود ایران میں بھی اس پائے کی کتاب نہ لکھی جاسکی، یہی وجہ ہے کہ ایران و افغانستان سے اس کے کئی فارسی ترجمے ہوئے، اردو کی یہ کتاب نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران و افغانستان کے اہل علم و ادب کی آنکھوں کا اب تک نور بنی ہوئی

ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان میں ایسے گراں قدر اضافے کی مثال شاید ہی ملے۔

موازنہ انیس و دبیر

موازنہ انیس و دبیر جس میں مرثیہ کی ابتدائی تاریخ اور اردو کے دو ممتاز مرثیہ نگاروں؛ انیس و دبیر کے مراثی اور ان شاعرانہ کمالات کا موازنہ ہے شبلی کی ایک منفرد کاوش ہے، اسی سے انیس کی شاعرانہ عظمت کا نقش دلوں میں قائم ہوا، اردو میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں خود موازنے کے جواب میں المیزان اور ردالموازنہ جیسی کتابیں سامنے آئیں تاہم موازنے کو جو مقبولیت ملی وہ کسی اور کے نصیب میں نہ آسکی۔ دو قریب العصر شعراء کے موازنے کا غالباً یہ پہلا کام ہے، بلکہ یہ کہا جائے کہ فن موازنہ کا اردو میں یہ پہلا نمونہ ہے تو بیجا نہ ہوگا، سید احتشام احمد ندوی نے اسی نقطہ نظر سے موازنہ کو حرف آخر قرار دیا ہے۔ (۱۱)

سیاسی ادب

ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات پر علامہ شبلی کی بڑی گہری نظر تھی، انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت، ظلم و جبر، ان کے عزائم اور استعماری کوششیں جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچ رہا تھا اس سے وہ بہت دل برداشتہ تھے، ان کی سیاسی نظموں میں اسی کرب کا اظہار ہے ؎

مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جینا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

ملی حالات اس سے بھی زیادہ ابتر اور دگرگوں تھے، انگریزوں کے تمام ظلم و جبر کے باوجود مسلمان مختلف الخیال اور مختلف الرائے تھے، چنانچہ علامہ شبلی نے قومی سیاست کو قابل اصلاح قرار دیا اور متعدد مضامین لکھے، اس سلسلے کا اہم مضمون مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ ہے جس میں مسلمانوں کی سیاست، حکومت نواز پالیسی، مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کے مضر اثرات، سیاست کی صحیح اسکیم، مسلمانوں کی سیاست کی خامیاں، ہندو مسلم اتحاد اور مسلم لیگ کی سیاست جیسے اہم نکات کا ذکر ہے، یہ مضمون بقول مولانا سید سلیمان ندوی ”اس قدر مدلل اور پرجوش تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر

دیا۔" (۱۲)

سیاسیات اس عہد کا عام موضوع تحریر تھا تاہم علامہ نے جس بلند ادبی اسلوب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی اس لیے ہم اسے سیاسی ادب کا بھی نام دے سکتے ہیں۔

مکتوباتی ادب

اردو کے مکتوباتی ادب میں بھی علامہ شبلی نے بڑا اضافہ کیا، انھوں نے اپنی ۳۲ سالہ علمی زندگی میں احباب و معاصرین کو بے شمار خطوط لکھے، جنھیں مولانا سید سلیمان ندوی نے دو حصوں میں مرتب کر کے شائع کیا، بمبئی کی دو خواتین کے نام شبلی نے جو خطوط لکھے تھے انہیں امین زبیری نے شائع کیا، ان کے علاوہ ان کے متعدد مکاتیب جو بعد میں دریافت ہوئے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، نقوش لاہور اور ادیب علی گڈھ اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

غالب کے مکتوبات نے اصلاً اس صنف ادب کو دوام بخشا، ان کے بعد مکتوباتی ادب میں علامہ شبلی ہی کے خطوط ادب و انشا کا نمونہ ہیں۔

خطوط غالب کے امتیازات اور خصوصیات کے پس منظر میں اگر شبلی کے مکاتیب کا جائزہ لیا جائے تو وہ مرزا غالب سے کم رتبہ نہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے ان کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے، مثلاً غالب کے مکاتیب میں ان کی زندگی، ان کا عہد اور بعض سیاسی حالات و واقعات کے علاوہ اور کوئی منظر نظر نہیں آتا جبکہ مکاتیب شبلی میں شبلی کی زندگی اور ان کے عہد کے علمی، ادبی، تاریخی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی حالات کے ساتھ عالم اسلام کے مسائل، یورپ کی چیرہ دستیاں، مستشرقین کی اسلام دشمنی غرض ان کے عہد کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے جس کی مدد سے ہم اس عہد کی ایک تاریخ قلم بند کر سکتے ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام نے اسی بنیاد پر مکاتیب شبلی کو قومی اعمال نامہ قرار دیا ہے۔ (۱۳)

اس قومی اعمال نامے کا اب تک بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا، ضرورت ہے کہ ان کی قدر و قیمت کے تعین کے ساتھ اسے جدید اسلوب و انداز میں مرتب کیا جائے اور دکھایا جائے کہ ان

خطوط میں کیا کچھ پوشیدہ ہے۔

سیرت نگاری

سب سے آخر میں علامہ شبلی آستانہ نبوت پر پہونچے اور شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر پیش کی، جس کو دنیا سیرۃ النبیؐ کے نام سے جانتی ہے ۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرت نگاری کی ایک طویل تاریخ ہے اس کے باوجود شبلی نے اس میدان میں جو کچھ کر دکھایا وہ کسی معجزے سے کم نہیں، ایک بڑے اہل قلم نے لکھا ہے کہ یہ اپنی خصوصیات میں سیرت کے سارے ذخیرہ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں، منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتی کی عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی۔ (۱۴)

اس دعوے پر بعض اہل قلم نے اعتراض وارد کیا ہے اور اس کی تردید میں خود سیرۃ النبیؐ پر متعدد اعتراضات کئے ہیں تاہم معترضین کو بھی اس کی انفرادیت کا اعتراف ہے(۱۵)اور کم از کم اتنا تو طے ہے کہ اردو کے سارے ذخیرہ کتب سیرت میں سب سے زیادہ بلند پایہ کاوش علامہ شبلی ہی کی ہے، یقیناً اردو کو اس گراں بہا تصنیف پر افتخار حاصل ہے۔

اسلوب نگارش

اردو کے عناصر خمسہ میں انشا پرداز کے لحاظ سے محمد حسین آزاد سب سے بلند مقام پر فائز ہیں، شبلی نے لکھا ہے کہ وہ گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح دوسرے عناصر کی نثر بھی اپنی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے کم رتبہ نہیں تاہم شبلی کا اسلوب نگارش سب سے منفرد، جداگانہ بلکہ عناصر اربعہ کے اسلوب کی تمام خصوصیات کا مجموعہ ہے(۱۶)، یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب نے بڑی مقبولیت پائی اور اس کی تقلید کی گئی۔

قوت، جوش، تکرار، ایجاز واختصار، طنز وتعریض، شعریت، نغمگی علامہ شبلی کے اسلوب کی نمایاں خوبیاں ہیں(۱۷) لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ علمی و ادبی اور تحقیقی وتنقیدی موضوعات میں بھی اس کی دلکشی اور ادبی رعنائی قائم رہتی ہے جبکہ دوسرے اسالیب میں یہ خوبی نہیں، بہرحال علامہ شبلی کے اسلوب نے بھی اردو کو ایک قابل فخر زبان بنانے

میں اہم کردار ادا کیا، بطور نمونہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو، مولانا روم کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام کو آج تیرہ سو برس ہوئے اور اس مدت میں اس نے بارہا بڑے بڑے صدمات اٹھائے، لیکن ساتویں صدی میں جس زور کی اس کو ٹکر لگی کسی اور قوم یا مذہب کو لگی ہوتی تو پاش پاش ہو کر رہ جاتا، یہی زمانہ ہے جس میں تاتار کا سیلاب اٹھا اور دفعتاً اس سرے سے اس سرے تک پھیل گیا، سیکڑوں ہزاروں اجڑ گئے، کم از کم ۹۰ لاکھ آدمی قتل کر دیے گئے سب سے بڑھ کر یہ کہ بغداد جو تاریخ اسلام کا تاج تھا اس طرح برباد ہوا کہ آج تک سنبھل نہ سکا، یہ سیلاب ۶۱۵ھ میں تاتار سے اٹھا اور ساتویں صدی کے اخیر تک برابر بڑھتا گیا یہ سب کچھ ہوا لیکن اسلام کا علمی دربار اسی اوج وشان کے ساتھ قائم رہا۔'' (۱۸)

شاعری

علامہ شبلی ایک خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے، مختلف اصناف مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، قطعہ، رباعی، ترکیب بند، مخمس اور غزل وغیرہ میں داد سخن دی، ایک مختصر کلیات ان کی یادگار ہے۔

شاعری میں علامہ شبلی کا وہ مقام نہیں جو نثری ادب میں ہے، تاہم ان کا شعری سرمایہ بہت اہم اور وقیع ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخی اور سیاسی نظموں کا باقاعدہ آغاز کیا (۱۹) اور مورخانہ شعور وآگہی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر سیاسی نظموں کو بانگ درا اور ضرب کلیم بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے علامہ شبلی کی نظموں کو اردو شاعری میں ایک نئی چیز بتایا ہے۔ (۲۰)

فنی لحاظ سے بھی ان کی شاعری میں پختگی اور مشاقی پائی جاتی ہے اور جوش وجذبات کے لحاظ سے تو وہ آپ اپنا پرتو ہے، آن کی نظم شہر آشوب اسلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک

چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگ صلیبی سماں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

بحیثیت مدیر

علامہ شبلی دو رسائل: محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڈھ اور ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے مدیر رہے ان رسائل کے ذریعہ بھی انھوں نے اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی، ان کے مشمولات سے ان کی متنوع خدمات کا اندازہ ہوتا ہے خاص طور سے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے جو ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں اس میں علامہ شبلی نے نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین لکھے بلکہ اردو کے چند نامور ترین اہل قلم کی تصنیف و تالیف کے لئے تربیت بھی کی ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالسلام ندوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ابوالکلام کی نثر، سید سلیمان ندوی

کی تحقیقات علمیہ اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی وتنقیدی کاوشیں شبلی ہی کی بدولت اردو کا حصہ بنیں۔

انجمن ترقی اردو

۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے، چنانچہ اسے ایک باقاعدہ ادارہ کی شکل دینے کی بھرپور کوشش کی، متعدد منصوبے بنائے، اہل قلم کو اس کی طرف متوجہ کیا، اشاعتی منصوبہ بنایا اور اس وقت کے ماحول میں اسے ایک فعال ادارہ بنادیا، ۱۹۰۵ء میں اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے وہ اس سے علاحدہ ہوگئے (۲۱)، تاہم قلیل مدت میں انھوں نے انجمن اردو کی جو خدمت کی اسے تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔

دارالمصنفین

علامہ شبلی کی آخری یادگار دارالمصنفین ہے جس کی خدمات کا دائرہ تقریباً ایک صدی پر محیط ہے اس نے علامہ شبلی کے تخیل اور منصوبوں کے مطابق اب تک دو سو سے زائد بلند پایہ کتابیں شائع کرکے علم وادب کے سرمایے میں نہایت وقیع اضافہ کیا ہے، جو علامہ شبلی ہی کا فیضان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ شبلی نے نہ صرف دامن اردو کو موتیوں سے بھر دیا بلکہ اسے نئی جہتوں اور بلندیوں سے آشنا کیا اور اسے ایک علمی زبان کا درجہ عطا کیا، اور اس لائق بنادیا کہ ہم دنیا کی بہترین زبانوں کے مقابلہ میں اسے فخر سے پیش کرسکتے ہیں۔

حوالے

(۱) موج کوثر ص ۲۳۴ - تاج کمپنی دہلی ۱۹۹۹ء

(۲) نیر جہاں، مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص ۵۷ دہلی ۱۹۹۸ء

(۳) الطاف فاطمہ، اردو ادب میں فن سوانح نگاری ص ۱۱۳ ۔ دہلی

(۴) ادیب شبلی نمبر ص ۵۵ ۔ علی گڈھ ستمبر ۱۹۶۰ء

(۵) مہدی افادی، افادات مہدی ص ۱۹۲ ۔ علی گڈھ ۱۹۸۵ء

(۶) علامہ شبلی۔ علم الکلام ص ۴۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۹۳ء

(۷) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۷۲۔ علی گڈھ ۱۹۹۴ء

(۸) کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر ص ۸۹۔ پٹنہ ۱۹۸۳ء

(۹) اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۸۷۔ علی گڈھ ۱۹۸۸ء

(۱۰) شبلی ایک دبستاں ص ۱۱۳۔ ڈھاکہ

(۱۱) سید احتشام احمد ندوی۔ فن موازنہ کا ارتقاء۔ فیض المصنفین، علی گڑھ

(۱۲) حیات شبلی ص ۶۱۴، اعظم گڈھ ۱۹۸۳ء

(۱۳) خورشید الاسلام۔ تنقیدیں ص ۵۲، دہلی ۱۹۶۴ء

(۱۴) معارف سلیمان نمبر ص ۱۷۸، اعظم گڈھ ۱۹۵۵ء

(۱۵) ترجمان الاسلام بنارس، جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء ص ۱۳

(۱۶) سعید انصاری۔ مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز ص ۸، لکھنؤ

(۱۷) سرسید اوران کے نامور رفقاء ص ۶۷، علی گڈھ ۱۹۹۴ء

(۱۸) سوانح مولانا روم۔ ص ۲۳ طبع جدید

(۱۹) مقدمہ کلیات شبلی ص ۱۸، دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع ششم ۱۹۸۷ء

(۲۰) مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ص ۱۸۲

(۲۱) ڈاکٹر خلیق انجم۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۳۰۵-۳۰۹۔ دہلی ۱۹۹۶ء

☆☆☆

تذکرہ گلشن ہند اور علامہ شبلیؒ

علامہ شبلی کی ذات علم و تحقیق سے عبارت تھی، انھوں نے علم و ادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں جو عظیم الشان کارہائے نمایاں انجام دیے اس کی ایک کڑی تذکرہ گلشن ہند کی تصحیح وتحشیہ اور اس کی اشاعت بھی ہے، جس سے عام طور سے لوگوں کو واقفیت نہیں، ان کی ضخیم اور مبسوط سوانح عمری حیات شبلی میں بھی اس کا ذکر نہیں آسکا ہے، حد تو یہ ہے کہ گلشن ہند کا مقدمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا مگر انھوں نے بھی علامہ شبلی کے اس کارنامے کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کیا اور جب ۱۹۳۴ء میں مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے گلشن ہند کو گلزار ابراہیم کے ساتھ دوبارہ شائع کیا تو انھوں نے بھی اپنے دیباچے میں علامہ شبلی کا نام لینا گوارہ نہ کیا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کی اس کاوش کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

گلشن ہند

یہ مشاہیر شعرائے اردو کا ایک قدیم تذکرہ ہے، جو اصلاً علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' کا ترجمہ ہے، اسے مرزا علی خاں لطف نے ۱۸۰۱ء میں جان گل کرسٹ کی فرمائش پر اردو کا جامہ پہنایا مگر مترجم مرزا علی خاں لطف نے اس میں اس قدر ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کیا کہ اس کی حیثیت ایک علاحدہ تذکرہ کی ہوگئی ہے، مثلاً گلزار ابراہیم میں ۳۲۰ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے مگر گلشن ہند میں صرف ۶۸ شعرا ہی جگہ پاسکے، اس طرح سرے سے اس کی ترتیب ہی بدل گئی ہے، ان ۶۸ شعرا کے تذکرہ میں مؤلف نے بڑے اضافے کیے ہیں، محی الدین قادری زور کی تحقیق کے مطابق مرزا علی خاں لطف نے تقریباً تیس

بتیس شعرا کے حالات اور نمونہ کلام میں اضافہ کیا ہے(۱) یہ اضافے بڑے وقیع اور بیش قیمت ہیں، بعض اضافے تو ایسے ہیں جن کا کسی اور تذکرہ میں ذکر نہیں اور نہ اس سے پہلے اہل علم ان سے واقف تھے، مثلاً عبدالقادر بیدل بھی اردو میں شعر کہتے تھے، میر حسن نے ایک مثنوی لکھی تھی جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو تھی، مرزا علی لطف نے میر حسن کے حالات میں اس مثنوی کا وہ حصہ جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہے نقل کر دیا ہے، جس کا اس سے پہلے اہل علم کو علم نہ تھا، اسی طرح اہل اردو میر اثر کی مثنوی خواب وخیال کے محض نام سے واقف تھے، مرزا علی خاں لطف نے اس مثنوی کے چند اشعار بھی پہلی بار نقل کیے۔

مرزا علی خاں لطف نے گلزار ابراہیم کے متعدد مباحث کو حذف کر دیا ہے خاص طور سے علی ابراہیم خاں مصنف گلزار ابراہیم کے بعض حالات اور بیانات کو، بہر حال گلشن ہند گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہونے کے ساتھ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت بھی رکھتا ہے، مؤلف تذکرہ مرزا علی لطف نے بھی اسے ترجمہ کی بجائے اپنی تالیف ہی قرار دیا ہے۔(۲)

مرزا علی خاں لطف کے اس کارنامے سے اہل قلم واقف نہ تھے، ۱۳۲۰ھ میں حیدرآباد میں ایک زبردست سیلاب آیا جس نے بڑی تباہی وبربادی مچائی، یہ سیلاب کسی آفت زدہ اہل علم کا کتب خانہ بھی بہا لایا، اس میں جو کتابیں برآمد ہوئیں ان میں یہ تذکرہ گلشن ہند بھی تھا، جو مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ دولت آصفیہ کے ہاتھ آیا، چنانچہ انھوں نے اسے علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں پیش کیا، وہ اس وقت حیدرآباد سے وابستہ اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے، اہمیت وافادیت کے پیش نظر ان کی خواہش تھی کہ اسے ایڈٹ کر کے انجمن کی طرف سے شائع کیا جائے، مگر عبداللہ خان ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ کے الفاظ میں ''انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے نہ چھاپ سکی (۳) اسی زمانہ میں علامہ شبلی حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ سے مستعفی ہو گئے، تاہم گلشن ہند کی طباعت واشاعت کا خیال ان کے دل سے نہ گیا، چنانچہ انھوں نے اس کی تصحیح ومراجعت کی، حواشی لکھے اور انجمن کی بجائے عبداللہ خاں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد سے اس کے طبع واشاعت کی خواہش ظاہر کی (۴) چنانچہ موصوف

نے ۱۹۰۶ء میں مولوی عبدالحق صاحب کے گراں قدر مقدمہ کے ساتھ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے طبع کرایا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے گلزار ابراہیم کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شایع کرایا، میرے پیش نظر گلشن ہند کا پہلا ایڈیشن ہے اور خوش قسمتی سے وہ مطبوعہ نسخہ ہے جو علامہ شبلی کے زیر مطالعہ رہا ہے، اس پر انھوں نے سرخ روشنائی سے سیکڑوں نشان لگائے ہیں، بعض الفاظ جملوں اور اشعار کو انڈر لائن کیا ہے، بعض الفاظ بھی لکھے ہیں مثلاً آبرو کی غزل پر ''غزل مسلسل سادہ و بے ردیف لکھا ہے'' (۵) یقین کے ایک شعر پر تشبیہ اور دوسرے پر تشبیہ مرکب لکھا ہے (۶) دو اشعار کے سامنے فنا لکھا ہے (۷) یک رنگ کے شعر پر صرف مرثیہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ (۸)

نشانات اور اشارات سے علامہ شبلی کی منشا و مراد کیا تھی اس کا پتہ نہیں چلتا، غالباً علامہ دوبارہ گلشن ہند پر حواشی لکھنا چاہتے تھے، کاش وہ ایسا کر سکے ہوتے تو یقیناً اردو ادب کے سرمایہ میں ایک اضافہ ہوتا، پہلے ایڈیشن میں انھوں نے جو حواشی لکھے ہیں وہ بھی کم اہمیت کے حامل نہیں، یہاں ان کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

گلشن ہند کی تصحیح و تدوین میں علامہ شبلی نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا، اس کی انھوں نے کہیں وضاحت نہیں کی ہے، البتہ ان کے قلم سے جو حواشی اور وضاحتی نوٹ ہیں، ان سے طریقۂ تصحیح و تدوین کا اندازہ کسی قدر ضرور ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ہی تحقیق و تدوین کے اصولوں سے بڑی حد تک کام لیا ہے، انھوں نے اصل سے [۱] تحقیق و مراجعت بھی کی ہے اور [۲] وضاحتی و تشریحی نوٹ بھی لکھے ہیں [۳] بعض اضافے بھی کئے ہیں [۴] املا کی تصحیح بھی کی ہے، اس کے علاوہ [۵] مفید علمی و تنقیدی حواشی بھی لکھے ہیں، ان ہی پانچ بنیادی امور سے تذکرہ گلشن ہند مزین ہو کر طبع و اشاعت کی منزل سے گزرا، یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ مولانا کے اسی عمل سے قدیم تذکروں اور نادر کتابوں کی ترتیب و تدوین کا رجحان پیدا ہوا اور انجمن کی طرف سے متعدد قدیم اور نایاب کتابوں کو ایڈٹ کر کے شایع کیا گیا۔

تحقیق و مراجعت

گلشن ہند کی تصحیح وتدوین سے پہلے اردو میں تحقیق ومراجعت کے کسی کام کا علم مجھ بے بضاعت کونہیں، اگر کوئی کام ہوا ہوتب بھی یہ امر یقینی ہے کہ اس کا عام رواج نہیں تھا اور نہ اس کے اصول متعین تھے اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام ہوا تھا، اس لئے گلشن ہند کی تصحیح وتحقیق کو اردو میں متنی تصحیح وتحقیق کا اولین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے، یہاں یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے متنی تحقیق کے سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے اس کا تعلق اردو کی بجائے فارسی تاریخ سے ہے۔

تحقیق ومراجعت کا عام دستور یہ ہے کہ اصل سے مقابلہ وموازنہ کیا جائے تا کہ نقل میں اگر کوئی تسامح ہو گیا ہوتو اس کی اصلاح یا وضاحت کردی جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دوسرے نسخے موجود ہوں، لیکن چونکہ گلشن ہند کا کوئی مخطوطہ اس وقت دستیاب نہ تھا، اس لئے اس سے مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ اب گلشن ہند کے اصل ماخذ گلزار ابراہیم اور بعض دوسرے شعرائے اردو کے تذکروں جیسے سخن شعراء از عبدالغفور نساخ وغیرہ سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ علامہ شبلی نے ان سے مقابلہ کیا اور متعدد وضاحتی نوٹ لکھے ان کے بعض حواشی سے بھی ان کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً مرزا محمد رضا امید کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

بازار حور وحسن ملک جلوہ پری　　　بامن کی بیٹی ایک میری آنکھ میں کھڑی

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بامن اصلاً برہمن ہے اور آخری لفظ کھڑی ہے جو دوسرے تذکروں میں پڑی ہے، علامہ شبلی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اور تذکروں میں کھڑی کے بجائے پڑی ہے جو درنظرم افتاد کا ترجمہ ہے(۹) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اور تذکروں سے اس کا موازنہ کیا تھا، ایک جگہ صراحتاً سخن شعرا کا بھی نام لیا ہے(۱۰)

وضاحتی و تشریحی نوٹ

فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر نثر کی جو کتابیں لکھی گئیں اس میں زبان وبیان کو سلیس، عام فہم اور شستہ وشگفتہ بنانے کی شعوری کوشش کی گئی، تذکرہ گلشن ہند میں بھی یہ خوبی موجود ہے،

چونکہ مقفع و مسجع نثر لکھنے کا اس دور میں عام رواج تھا اس لئے شعوری کوشش کے باوجود گلشن ہند میں بعض مقامات پر اس کے اثرات آگئے ہیں، دوسری بات یہ کہ یہ تذکرہ اپنی تالیف کے سو سال بعد شایع ہوا، اس لئے قدرتی طور پر وہ سلاست اور روانی نہیں جو انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو نثر کا جوہر و خاصہ تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ ثقیل اور مبہم عبارتوں کی توضیح و تشریح کر دی جائے، قدیم دیہی اور عوامی الفاظ جواب تقریباً ناقابل فہم ہو چکے ہیں ان کی نشان دہی بھی کر دی جائے تاکہ اصل مفہوم کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو، چنانچہ علامہ شبلی نے گلشن ہند کی تصحیح میں خاص طور سے ان کی توضیح و تشریح کا اہتمام کیا ہے، اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

گلشن ہند کے مقدمہ میں مرزا علی خاں لطف کا ایک جملہ ہے ''جس کی سیف دشمن گداز کے مضمون نے دو مصرعہ آبدار کو بخشا رتبہ ذوالفقار کا'' علامہ شبلی نے ''یعنی ذوالفقار کا رتبہ بخشا'' لکھ کر اس جملہ کی وضاحت کی ہے (۱۱) اسی طرح اس عبارت ''جس کی بہار گلشن عدالت میں تحقیقات ہے چاک گریباں گل کی'' کی علامہ شبلی نے یوں وضاحت کی ہے ''یعنی گریبان گل کی چاک کی تحقیقات ہے (۱۲) گلشن ہند کے مولف کی ایک عبارت ہے ''کرم نام سی کی ندی سے'' علامہ شبلی نے اس کا مفہوم ''اس ندی سے جس کا نام کرم تھا'' لکھ کر بیان کیا ہے (۱۳) مرزا علی لطف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اس میں بندوقوں کی مار سے نشان کے ہاتھی کا منہ پھر گیا'' یہ عبارت عام لوگوں کو بہ آسانی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی چنانچہ علامہ نے اس کے حاشیہ میں صرف یہ لکھا ہے کہ ''یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا'' (۱۴) اس وضاحت سے عبارت کا مفہوم بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔

میر حیدر حیران کے حالات میں ایک جملہ ہے ''شاگرد رائے سرپ سنگھ دیوانہ تخلص استاذ کے'' علامہ شبلی اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی کی وجہ سے سخت تعقید پیدا ہوگئی ہے، مطلب یہ ہے کہ سرپ سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے اور جو استاد فن ہیں حیران ان کے شاگرد ہیں۔'' (۱۵)

علامہ شبلی نے متعدد مبہم اشعار کا مفہوم اور ان کی فنی خامیوں کو بھی مختصر سے جملوں میں واضح کیا ہے، مثلاً ایک شعر ہے ؎

کی اس افغان بچے نے شوکت شاہی برباد
کون پہونچے گا خدا چھٹ مری ہاری کو

دوسرے مصرعے میں خدا چھٹ کی وضاحت "سوائے خدا کے" لکھ کر کی ہے (۱۶) ظاہر ہے خدا چھٹ کو سمجھنا آسان نہ تھا اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

حق طفلاں جو ہوا انیس برس میں تھا جمع
مار کر لے گئے ہاں چھوڑ سبک باری کو

دوسرے مصرعے میں سبک باری کی تشریح کرتے ہوئے علامہ نے لکھا ہے کہ "یہاں صرف سبک باری اور تہی دستی چھوڑ گئے" ہے (۱۷)

شیخ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کا ایک شعر ہے ؎

مجھے تو ڈھو کے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

اشتیاق دہلوی نے پہلے مصرعہ میں لفظ ڈھو کے استعمال کیا ہے، علامہ شبلی نے اس کے معنی دینا بتایا ہے (۱۸) خواجہ امین الدین امین عظیم آبادی کا ایک شعر ہے ؎

مرتے ہیں ہم تو اس کے لب آبدار پر
گر آب زندگی ہو تو مارے ہیں دھار پر

علامہ شبلی نے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں آئے لفظ آب زندگی کی وضاحت اس طرح کی ہے:۔

"آب زندگی سے آب حیات مراد ہے جس پر خضر کا قبضہ کہا جاتا ہے" (۱۹)

جرأت کا ایک شعر ہے ؎

دل بھڑکے ہے تک مصحف رو جان دکھادے
سرگرم ہے آتش اسے قرآن دکھادے

دوسرے مصرعہ میں قرآن دکھانے کا مفہوم آسان نہیں تھا، کیونکہ اس کا ایک رسم سے تعلق ہے، علامہ شبلی نے اس پر جو وضاحتی نوٹ لکھا ہے، اس سے اس شعر کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

''جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جائے''(۲۰)

میر باقر حزیں کے اس شعر ؎

تو نہ ڈر ٹک اٹھا نقاب کے تئیں   میں سمجھالوں گا اضطراب کے تئیں

کے لفظ ''سمجھالوں'' کے بارے میں علامہ نے لکھا ہے کہ یہ تقطیع میں نہیں آسکتا اس لئے وہ ''سنبھالوں'' ہوگا (۲۱) اسی طرح محمد یار خاکسار عظیم آبادی کی غزل کے مقطع ؎

خاکسار عرش سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج

آپ میں اور آ ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

کے پہلے مصرعہ کے لفظ عرش کے بارے میں علامہ نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس کا عین تقطیع سے گرتا ہے (۲۲) اس جملہ سے فن عروض پر علامہ کی گہری نظر کا بھی انداز ہوتا ہے۔

مرزا محمد رضا امید اصلا فارسی کے شاعر تھے تاہم انھوں نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے، گلشن ہند میں ان کے اردو کلام کے جو نمونے ہیں ان پر بھی فارسی کا شبہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ انھوں نے جو الفاظ ومحاورات استعمال کئے ہیں ان میں بھی بڑی ثقالت ہے جس سے ان کے اشعار سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے، چنانچہ علامہ شبلی نے ان کے کلام پر کئی وضاحتی نوٹ لکھے ہیں، جن سے ان کے اشعار کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، مثلاً امید کی غزل کا ایک مصرعہ ہے۔

ع: گفتا کہ ڈاڑھی جار مغل تجھ کو کیا پڑی

ڈاڑھی جار کی وضاحت ریش سوختہ لکھ کر علامہ نے کی ہے (۲۳) اسی غزل کے تیسرے شعر میں لفظ کرتار کا استعمال امید نے کیا ہے، ہندی الاصل ہونے کی وجہ سے اس کے معنی بتانا ضروری تھا چنانچہ علامہ نے کرتار کے معنی خدا کے لکھ کر وضاحت کی ہے (۲۴) اسی طرح اور بھی کئی اشعار پر مختصر سے نوٹ ہیں مثلاً آصف کے قطعہ کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

جام عمر کا بھرتے ہیں لبریز   خلق کا عیش کا ایاغ ہوا

اس کے دوسرے مصرعے کی وضاحت علامہ شبلی کے الفاظ میں ''یعنی خلق کے عیش کا

ایاغ لبریز ہوا" ہے (۲۵) اسی طرح مرزا علی خاں لطف نے حمد کے جو اشعار لکھے ہیں ان میں ایک شعر یہ ہے ۔

چمن کے ہم نے معنی کی جو لی باس تو ہر گل کی نئی بو ہے نئی باس

اس شعر کے پہلے مصرعہ کے بارے میں علامہ نے لکھا ہے کہ اس مصرعہ میں تعقید ہے، اصل عبارت یوں ہے معنی کے چمن سے جو ہم نے باس لی، باس لینا یعنی خوشبو سونگھنا وغیرہ (۲۶)

عام طور سے مورخین اورنگ زیب کو اس کے نام کی بجائے خلد مکاں لکھتے ہیں، مرزا علی خاں لطف نے بھی کئی جگہ خلد مکاں لکھا ہے، علامہ شبلی نے اس کی بھی وضاحت یعنی اورنگ زیب عالم گیر لکھ کر کی ہے (۲۷)

گلشن ہند میں ایک شعر کا پہلا مصرعہ مکمل نہیں ہے اس میں کوئی ایک لفظ چھوٹا ہوا ہے، چونکہ علامہ نے اس کا مقابلہ بعض دوسرے تذکروں سے کیا ہے اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً وہ مکمل مصرعہ انھیں کہیں نہیں مل سکا اس لئے انھوں نے بھی اس کو نامکمل ہی چھوڑ دیا ہے البتہ حاشیہ میں خیال ظاہر کیا ہے کہ غالباً چھوٹا ہوا لفظ "بہ ابہام" ہے (۲۸) یہ قرین قیاس بھی ہے کیونکہ بہ ابہام لکھ دینے سے مصرعہ مکمل ہو جاتا ہے۔

طوالت کے خوف سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے اس طرح کے متعدد وضاحتی وتشریحی حواشی اور فٹ نوٹ لکھے ہیں، ان کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے، گو اب بھی بعض مباحث اور اشعار توضیح طلب رہ گئے ہیں تاہم جس قدر توضیحات کردی گئی ہیں ان سے نہ صرف تذکرہ گلشن ہند کے سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ قدیم اردو شعروادب کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اضافات

گلشن ہند کی تصحیح میں حواشی کے علاوہ بعض اشعار کے اضافے بھی علامہ نے کئے ہیں، مثلاً شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی کا تذکرہ مختصر تھا اور نمونہ کلام بھی درج نہ تھا علامہ شبلی نے ان کے ذکر میں سخن شعراء از عبدالغفور نساخ سے ان کے یہ چار اشعار بطور نمونہ نقل کئے ہیں ۔

تیری زلفوں میں پھنسا دل یہی تقصیر ہوئی | نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہ گار مئے دل
نالے سدا بہر بھروں عمر کے بھرتے ہیں | ہیں نزع میں ہم تجھ بن نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ بہ ستم رسیدہ | رہتا ہے مدام آبدیدہ
تمہارے در پر جو دربان نے آستیں پکڑی | برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

اس اضافے کی خود علامہ نے بھی صراحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

''اصل کتاب میں نمونہ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف ہی کو نہیں ملا یا جس نسخہ سے ہم نے نقل کیا ہے اس کے کاتب نے چھوڑ دیا ہے، مندرجہ بالا چہار شعر ہم نے سخن شعرا مصنفہ نساخ سے نقل کئے ہیں۔''(۲۹)

اس کے علاوہ علامہ شبلی نے اور کوئی حذف و اضافہ نہیں کیا ہے، البتہ متعدد اہم شعرا کے کلام کو مولوی عبدالحق صاحب نے حذف کر دیا ہے، عبداللہ خاں لکھتے ہیں:-

''اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے، البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونہ کلام جو اس تذکرہ میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا اس میں صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے، اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا''(۳۰)

مگر خود مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:-

''مؤلف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے، صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا، ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے، خود مؤلف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دئے تھے، اس میں بھی انتخاب

کر دیا گیا''۔(۳۱)

اس سے انتخاب وتصرف کی وجہ تو معلوم ہو جاتی ہے مگر کس نے انتخاب وتصرف کیا یہ نہیں معلوم ہوتا۔

صحت املا اور ناموزوں اشعار

گلشن ہند کی تصحیح میں علامہ شبلی نے املا کی اصلاح اور درستگی کی طرف بھی خاص توجہ دی ہے، مثلاً ایک لفظ ''کھلایا'' استعمال ہوا ہے، علامہ نے لکھا ہے کہ یہ کھلوایا ہے(۳۲)ایک دوسرا لفظ ''ہو جا گا'' لکھا ہے علامہ نے ہو جائے گا لکھ کر تصحیح املا کی ہے(۳۳)اسی طرح میر شمس الدین فقیر کے ایک شعر میں لفظ ''پھاند'' استعمال ہوا ہے علامہ نے لکھا ہے کہ آج کل اسے باندھ بولتے ہیں(۳۴)امید کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

دست اغیار ہے زیر سر یار آج امید کو ڈھب صحبت ہے

لفظ ڈھب پر حاشیہ میں علامہ شبلی نے اس کا املا کڈھب بتایا ہے(۳۵)

قدیم شعرائے اردو نے بھی بعض الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جو لکھے کسی اور طرح سے جاتے ہیں اور ان کا تلفظ کچھ اور ہوتا ہے، تلفظ کی ذرا سی بے توجہی سے اشعار ناموزوں اور بحروں سے گر جاتے ہیں مثلاً قدما کے یہاں دیکھو کا دکھو، نہیں کا نہ، اور کوئی کا کُئی تلفظ ہے، تذکرہ گلشن ہند میں جہاں اس طرح کا تلفظ ہے علامہ شبلی نے اس کی صراحت کر دی ہے اور لکھا ہے کہ اس لہجہ میں نہ پڑھنے سے مصرعے ناموزوں ہو جائیں گے(۳۶)

علمی ادبی اور معلوماتی حواشی

گلشن ہند کی تصحیح میں متعدد علمی، ادبی اور معلوماتی حواشی علامہ شبلی کے قلم سے ہیں، مثلاً مولف تذکرہ نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے تذکرہ میں ان پر اور شاہ عبدالعزیز صاحب پر تنقید کی ہے اور ان کی شان میں یہ شعر لکھا ہے ؎

شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزود ہے ☆ بھونک میں کتے کی، بلی کی نگی موجود ہے

اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مولف تذکرہ ان دونوں بزرگوں کی ہجو کر رہا ہے،

علامہ شبلی اس شعر کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

> ''شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح کی ہے اور اس شعر نے تو صاف پردہ اٹھا دیا ہے''(۳۷)

مولف تذکرہ نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی دو کتابوں قرة العين فی ابطال شهادة الحسين اور جنت العالية فی مناقب المعاوية کا ذکر کیا ہے، علامہ شبلی اس کی تردید و تصحیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دونوں نام غلط ہیں پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے، شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدانخواستہ ان کو کوئی تعلق نہیں اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے، معاویہؓ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں''(۳۸)

یہاں صاحب گلشن ہند سے یہ سہو ہوا ہے کہ انھوں نے شیخ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کو جو شیخ عبدالاحد بن محمد سعید سرہندی کی اولاد میں تھے اور شاہ ولی اللہ ابن عبدالرحیم دہلوی کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے، علامہ شبلی نے صاحب گلشن ہند کے اس اشتباہ کا ازالہ اپنے حاشیہ میں نہیں کیا ہے اور غالباً وہ اس اشتباہ کو نہ سمجھ سکے۔

سراج الدین علی خاں آرزو نے شیخ محمد علی حزیں ایرانی کی شاعری پر ایک تنقیدی کتاب تنبیہ الغافلین لکھی تھی، مولف تذکرہ گلشن ہند نے آرزو کے تذکرہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ آرزو نے ناحق اپنی طبیعت محجوب کی اور دیوان شیخ کے بہت سے اشعار سقیم ٹھہرائے، علامہ شبلی نے حاشیہ میں مزید یہ وضاحت کی ہے کہ آرزو کی تنقید کے جواب میں مولوی امام بخش صہبائی نے ایک رسالہ قول فیصل کے نام سے لکھا ہے جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جوابات دئے ہیں(۳۹) اسی طرح آرزو کے رسالہ موہبت عظمیٰ کے بارے میں علامہ نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ چھپ گیا ہے(۴۰) آرزو کے ایک تذکرہ کا ذکر بھی مرزا علی لطف نے کیا تھا مگر اس کا نام انھوں نے نہیں لکھا ہے، اس کا نام مجمع النفائس ہے علامہ

نے اس کی بھی نشان دہی کی ہے۔(۴۱)

بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے مماثل ہیں یا ان میں ادنی تغیر پایا جاتا ہے، علامہ نے حواشی میں ان کی بھی صراحت کی ہے مثلاً شاہ نجم الدین آبرو کا ایک شعر ہے ؎

جہاں کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے ☆ کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

اس شعر پر علامہ نے لکھا ہے کہ یہی شعر بہ ادنی تغیر جرات کی طرف منسوب ہے(۴۲)اسی طرح مرزا جعفر علی حسرت کے اس مصرعہ ؏ :

لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے

کے بارے میں بھی علامہ نے لکھا ہے کہ یہ جرأت کی طرف بھی منسوب ہے مگر یہ صراحت نہیں کی کہ اصلاً یہ کس کا مصرعہ ہے(۴۳) بعض ہم مضمون اشعار کی بھی علامہ شبلی نے نشان دہی کی ہے مثلاً خواجہ میر درد کے اس شعر ؎

تیری خوں آشامیاں مشہور ہیں اے تیغ یار ☆ ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو

کے ہم مضمون شیخ ابراہیم ذوق کا یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہے ؎

کہے ہے اس سے دم ذبح یہ گلو میرا ☆ کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

لیکن علامہ کا یہ بھی خیال ہے کہ ذوق کا شعر خواجہ میر درد کی بندش کو نہیں پہونچتا(۴۴)

تذکرہ گلشن ہند جان گل کرسٹ کی فرمایش پر لکھا گیا ہے۔جس کی صراحت مرزا علی خاں لطف نے تمہید ہی میں کردی ہے، جان گل کرسٹ کے کارناموں کا اہل اردو نے برملا اعتراف کیا ہے،اور متعدد کتابیں ان پر لکھی جا چکی ہیں،علامہ شبلی بھی ان کے مداح اور ان کے کاموں کے معترف ہیں،گلشن ہند میں جہاں ان کا ذکر آیا ہے اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

"یہ وہی گل کرسٹ صاحب ہیں جن کی ایما سے میر امن نے چہار درویش (باغ و بہار) لکھی درحقیقت اردو زبان کا ریفارمر یہی شخص ہے"(۴۵)

مرزا علی خاں لطف نے ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگ کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کے نام کے ساتھ ان القاب کو بھی لکھا ہے جو اس کو شاہی دربار سے ملے تھے مثلاً عماد الدولہ اور امیر الممالک وغیرہ، علامہ شبلی نے اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے اور اس تاریخی نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ:-

''اس عہد میں ہندوستان کے گورنر جنرل دلی کے دربار سے خطاب حاصل کرتے تھے اور اس کو فخریہ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے''(۴۶)

انیسویں صدی کے شروع میں اردو مسجع و مقفع لکھی جاتی تھی، عام فہم اسلوب تحریر کسر شان خیال کیا جاتا تھا، فورٹ ولیم کالج میں عام فہم، سادہ اور سلیس زبان اس لئے استعمال کی گئی ہے کہ نو وارد انگریزوں کو ہندوستان پر حکمرانی میں آسانی ہو۔ مرزا علی لطف لکھتے ہیں:-

''مدعائے دلی اس صاحب عالی تدبیر (گل کرسٹ) کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم ان کی تربیت کے لئے سارا یہ خون جگر کھاتے ہیں تاکہ ان کے ذہنوں میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزا اٹھاوے''۔(۴۷)

اس اقتباس پر علامہ شبلی نے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

''اس فقرہ سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہل قلم سادہ اردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے، مصنف صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر سے اس نے یہ ذلت گوارا کی''(۴۸)

گلشن ہند میں مرزا مظہر جان جاناں کا تذکرہ بھی ہے، ان کی تاریخ وفات پر علامہ شبلی کے قلم سے بے ساختہ یہ جملہ آ گیا ہے:-

''کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے عاش حمیدا مات شہیدا لطف یہ کہ یہ الفاظ حدیث نبوی ﷺ کے ہیں''(۴۹)

خواجہ میر اثر کے تذکرہ میں ان کی مثنوی خواب وخیال کا بھی مرزا علی خاں لطف نے ذکر کیا ہے اور نمونہ کے طور پر اس کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں، علامہ شبلی نے اس پر بھی ایک نوٹ لکھا ہے جس میں مثنوی خواب وخیال کے بارے میں مولانا حالی کے موقف پر تنقید کی ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

''مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ (مقدمہ شعرو شاعری) میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا، یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں، اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ بن سکتی ہے؟'' (۵۰)

علامہ شبلی کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رائے سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، مولوی صاحب علامہ کی تنقیص ومذمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، گلشن ہند کے مقدمہ میں انھوں نے علامہ شبلی کے تصحیح وتحشیہ اور اس کی طباعت کی کوششوں کا اعتراف تو درکنار ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کیا، البتہ ان کے مذکورہ بالا حاشیہ کی تردید میں کئی صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

''ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف اعتراف کا لفظ لکھا، حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے، بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر وانیس (انیس

ودبیر) میں اتنا نہیں سراہا، اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی ہے، عام شاعری پر یا اردو شاعری کے نشو ونما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آگیا ہے اور اس میں دلی لکھنو والے دونوں ہیں اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کرلیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں تنقید کے روادار نہیں، مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے، اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، وہ صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہوسکتی ہیں تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بت جنھیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے یکایک متزلزل ہوگئے اور ڈھ گئے، زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نقطہ چینی سے پیدا ہوگیا ہے، مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لئے نقطہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دے رکھا ہے مجھے تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کردیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس سے پوری قلعی کھل جائے، حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کوی تعلق ہی نہیں"(۵۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا حالی کا مقدمہ شعروشاعری اردو میں فن تنقید کا پہلا بڑا کارنامہ ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی تخصیص نہیں کی

گئی ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بغیر نام لئے مولانا حالی نے دبستان لکھنو پر سخت تنقیدیں بھی کی ہیں، رہا سوال مثنوی خواب وخیال سے نواب مرزا شوق کے استفادے کا تو بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی خواب وخیال نواب مرزا شوق کی نظر سے ضرور گزری تھی اور بعض اشعار میں تو معمولی سا فرق ہے، مگر گلشن ہند میں خواب وخیال کے جو اشعار بطور نمونہ دئے گئے ہیں ان سے ذرہ برابر بھی پتہ نہیں چلتا کہ مرزا شوق کی مثنوی اس سے مستفاد ہے اور اس سے علامہ شبلی کے موقف کی بھی تائید ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کے اس خیال کو کہ مولانا حالی نے ''میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر وانیس (انیس ودبیر) میں انہیں اتنا نہیں سراہا'' کس قدر خلاف حقیقت ہے اور پھر مولوی صاحب کا یہ فرمانا کہ ''مثنوی سحر البیان کا اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں'' صریحاً غلط بیانی ہے۔

مثنوی گلزار نسیم کے متعلق مولانا حالی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے علامہ شبلی کی رائے اس کے برعکس ہے، ان کی اس رائے کو چکبست نے دیباچہ گلزار نسیم میں نقل کر دیا ہے نقادوں کے درمیان متضاد آرا کی یہ پہلی مثال نہیں ہے، اس کے باوجود مولوی عبدالحق صاحب گلشن ہند کے مقدمہ میں چراغ پا ہو گئے ہیں اور لکھتے ہیں:-

> ''افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بہ طور سند کے درج فرمایا ہے، تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پر ہیں'' (۵۲)

مولوی عبدالحق کی ان خردہ گیریوں سے قطع نظر علامہ شبلی نے تذکرہ گلشن ہند کی تصحیح و مراجعت کی، املا کی درستگی پر توجہ دی، مفید اور معلومات افزا حواشی لکھے، اس کی اشاعت کے لئے فکر مند رہے، مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ انھوں نے اس پر ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا (۵۳) جس کو مولوی عبدالحق صاحب نے معلوم نہیں کیوں شامل اشاعت نہیں کیا۔

حوالے

(۱) محی الدین قادری زور، دیباچہ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن ، ۱۹۳۴ء

(۲) خاتمہ گلشن ہند، ص ۱۹۶، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور

(۳) گلشن ہند، پبلشر کی التماس ص ۲

(۴) ایضاً

(۵) گلشن ہند ص ۲۶

(۶) ایضاً ص ۱۸۹

(۷) ایضاً ص ۱۸۸ و ۱۹۳

(۸) ایضاً ص ۹۶

(۹) ایضاً ص ۲۲

(۱۰) ایضاً ص ۱۰۲

(۱۱) ایضاً ص ۲

(۱۲) ایضاً ص ۴

(۱۳) ایضاً ص ۷

(۱۴) ایضاً ص ۸

(۱۵) ایضاً ص ۸۵

(۱۶) ایضاً ص۱۱

(۱۷) ایضاً

(۱۸) ایضاً ص۳۵

(۱۹) ایضاً ص۴۲

(۲۰) ایضاً ص۷۵

(۲۱) ایضاً ص۸۳

(۲۲) ایضاً ص۹۷

(۲۳) ایضاً ص۲۲

(۲۴) ایضاً

(۲۵) ایضاً ص۱۴

(۲۶) ایضاً ص۱

(۲۷) ایضاً ص۱۷

(۲۸) ایضاً ص۱۳۰

(۲۹) ایضاً ص۱۰۲

(۳۰) ایضاً پبلشر کی التماس ص ۲

(۳۱) ایضاً مقدمہ ص ۲۴

(۳۲) ایضاً ص۶۹

(۳۳) ایضاً ص۷۰

(۳۴) ایضاً ص۱۲۹

(۳۵) ایضاً ص۲۲

(۳۶) ایضاً ص۲۶و۸۷

(۳۷) ایضاً ص۳۴

(۳۸)　ایضاً

(۳۹)　ایضاً ص ۲۳

(۴۰)　ایضاً ص ۲۴

(۴۱)　ایضاً

(۴۲)　ایضاً ص ۲۷

(۴۳)　ایضاً ص ۸۵

(۴۴)　ایضاً ص ۴۴

(۴۵)　ایضاً ص ۲

(۴۶)　ایضاً

(۴۷)　ایضاً ص ۳

(۴۸)　ایضاً

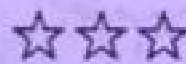
(۴۹)　ایضاً ص ۱۶۰

(۵۰)　ایضاً مقدمہ ص ۳۲

(۵۱)　گلشن ہند مقدمہ ص ۱۹-۲۰

(۵۲)　ایضاً ص ۲۱

(۵۳)　ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء ص ۲۶۲



کچھ موازنہ انیس ودبیر کے بارے میں

ماہنامہ الرشاد فروری ۲۰۰۸ء کے شمارے میں ڈاکٹر فیضان نے موازنہ انیس ودبیر کے طبع جدید (اپریل ۲۰۰۴ء) کا موازنہ ومقابلہ اس کے ایک مخطوطہ محفوظہ نیشنل میوزیم دہلی سے کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ مطبوعہ اور مخطوطہ میں زمین آسمان کا فرق ہے، وہ لکھتے ہیں:-

''آیئے جستہ جستہ اس کے عناوین، حواشی اور مباحث پر نظر ڈالیں اور مطبوعہ موازنہ انیس ودبیر طبع جدید اپریل ۲۰۰۴ء (ایڈیٹڈ بائی ڈاکٹر ایم الیاس اعظمی) سے تقابل کریں، کسی کی تنقیص مراد نہیں ہے، مطالعہ کے دوران یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ مطبوعہ اور مخطوطہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے، جو حواشی یا ہدایات مخطوطہ میں دی گئی ہیں مطبوعہ میں ان کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مولانا نے جن سطروں یا عنوانات کو سرخ قلم سے قلم زد کیا ہے یا حواشی لگائے ہیں مطبوعہ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، عناوین اور ذیلی سرخیوں کو بھی ایڈٹ کردیا گیا ہے، مولانا کچھ لکھتے ہیں اور مطبوعہ میں کچھ اور ہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیور طباعت سے آراستہ کرتے وقت اصل مخطوطہ سامنے نہیں تھا، پوری کتاب تضادات سے پر ہے، ثبوت کے طور پر جستہ جستہ پیش کررہا ہوں۔

جو تمہید مطبوعہ کتاب میں شامل ہے مخطوطہ میں نہیں ہے تو پھر یہ تمہید کس کی ہے؟(۱)

چونکہ اس سے موازنہ انیس و دبیر کی حیثیت مجروح ہوتی ہے، اس لئے اس کی تحقیق ضروری ہے۔

۱-موازنہ انیس و دبیر کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے خود علامہ شبلی نے طبع کرایا، اس کی اشاعت کے سات برس بعد ۱۹۱۴ء میں انھوں نے وفات پائی لیکن اس مدت میں انھوں نے کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ موازنہ کے متن میں کاتب یا طابع نے حذف واضافہ کیا ہے اور اصل مسودہ کے برخلاف کتاب شائع ہوئی ہے۔

۲-موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں ردالموازنہ، تردیدالموازنہ اور المیز ان جیسی کتابیں اور سیکڑوں مضامین و مقالات شائع ہوئے، ملک و بیرون ملک سے دسیوں ایڈیشن نامور محققین کی تصحیح و مراجعت کے بعد طبع ہوئے لیکن کسی اہل قلم اور نقاد نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ اس کے اصل متن میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے۔

۳- جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے نوسو صفحوں کی ضخیم حیات شبلی لکھی جس میں علامہ شبلی کی تمام تصنیفات کا پس منظر و پیش منظر بھی بیان کیا لیکن انھوں نے یہ انکشاف نہیں کیا کہ موازنہ انیس و دبیر اصل کے مطابق طبع نہیں ہوئی۔

۴-تقریباً ایک صدی بعد (۲۰۰۴ء) میں نامور اہل قلم، ادیب و نقاد اور دارالمصنفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی خواہش پر موازنہ کی تصحیح و مراجعت کا کام راقم نے انجام دیا اور اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا اہتمام کیا:

۱-اس کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۰۷ء کے مطابق اس کے متن کی تصحیح کی گئی، اس سلسلے میں یہ واضح کردوں کہ متعدد مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ و موازنہ کیا گیا لیکن کسی قسم کا فرق و اختلاف متن نہیں ملا، محض کتابت کی چند غلطیاں درآئی تھیں جن کی اصلاح کردی گئی۔

۲-عربی و فارسی مرثیے کی اجمالی تاریخ اور اس سلسلے کے جو واقعات علامہ شبلی نے نقل کئے تھے اور جن کے حوالے رہ گئے تھے اصل کتابوں سے ان کے حوالے دئے گئے۔

۳-علامہ شبلی نے مراثی انیس و دبیر کے سیکڑوں اشعار اور بند بطور نمونہ نقل کئے ہیں

مطبوعہ مراثی انیس و دبیر سے ان کا مقابلہ کیا گیا اور اگر کہیں کوئی فرق نظر آیا تو متن میں نہیں بلکہ حاشیے میں ان کی وضاحت کی گئی، تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل مطبوعہ مراثی انیس و دبیر وخلیق سے ایک ایک شعر اور ایک ایک بند تلاش کر کے ان کے حوالے دئے گئے، غرض جس قدر تصحیح و مراجعت ممکن تھی اس سے دریغ نہیں کیا گیا، یہی وجہ ہے تھی کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم جیسے صاحب نظر نے داد دی اور لکھا کہ:-

''موازنہ انیس و دبیر کی طباعت کا مسئلہ سامنے آیا تو ضروری سمجھا گیا کہ تصحیح و تحقیق اور مراجعت کے بعد اسے شائع کیا جائے، لیکن یہ کام مشکل تھا اور اسے وہی شخص کرسکتا تھا جس کی نظر اردو کے کلاسیکی ادب و شاعری پر ہو اور وہ جدید ادبی تحریکوں و نظریات سے بھی واقف ہو......... ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو مولانا شبلی سے بڑی عقیدت اور دارالمصنفین سے عشق ہے، ان کا خاص موضوع تحقیق یہی ہے اور وہ اس کے ہر کام میں پیش پیش رہتے ہیں، انھیں جب میری اس پریشانی کا علم ہوا تو انھوں نے بڑی خوشی سے تصحیح و مراجعت کی ذمہ داری قبول کرلی اور بڑی محنت و جانفشانی سے یہ کام انجام دیا اور جہاں تک بن پڑا اشعار کی صحت کے لئے مراجع و مصادر کھنگالے اور کاپیوں اور پروف کی تصحیح بھی دلچسپی سے کی اس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں (۲)

البتہ راقم کو اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ فیضان صاحب نے جس مخطوطہ کا ذکر کیا ہے تصحیح و مراجعت کے وقت اس کا مجھے علم نہیں تھا، لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطبوعہ اور مخطوطہ موازنہ انیس و دبیر میں معتبر کون ہے؟ اس لیے کہ مخطوطہ پر بقول فیضان صاحب کے علامہ شبلی کی اصلاحات موجود ہیں، جب کہ مطبوعہ خود انھیں کی زیر نگرانی شائع ہوا۔

اس عقدہ کو حل کرنے کے لئے میں مکاتیب شبلی اور حیات شبلی کا مطالعہ کیا، تو درج ذیل باتیں سامنے آئیں:-

موازنہ انیس و دبیر کی ترتیب و تسوید دو مرتبہ ہوئی، پہلی بار ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد میں علامہ شبلی نے اسے مرتب کیا، مخطوطہ دہلی کے اس جملہ ”در ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء تمام شد“ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اور دوسری بار اکتوبر ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں یہ کام انجام پایا۔ (۳)

پہلی بار علامہ شبلی نے جو مسودہ تیار کیا تھا وہ میر کاظم علی معتمد تعمیرات عامہ سرکار عالی حیدرآباد کے دفتر میں تھا، اور عرصہ تک ان کے پاس پڑا رہا۔ (۴) مولانا حالی نے اسے دیکھا تھا، اپنے ایک خط میں انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے اور اسے نامکمل قرار دیتے ہوئے خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے علامہ شبلی کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ اسے مکمل کر دیں (۵) ڈاکٹر فیضان نے جس مخطوطے کو اصل موازنہ قرار دیا ہے اور جس کی بنیاد پر طرح طرح کے انکشافات کئے ہیں غالباً موازنے کا یہ وہی ناقص اور ناتمام مسودہ ہے جو عرصہ تک حیدرآباد میں پڑا رہا اور پھر کہیں سے نیشنل میوزیم کے ہاتھ آ گیا۔

بعض داخلی شہادتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً فیضان صاحب نے لکھا ہے کہ مخطوطہ میں تمہید نہیں ہے، جب کہ مطبوعہ میں تمہید موجود ہے۔ جس کی بنیاد پر انھوں نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ آخر یہ تمہید کس کی ہے؟ (۶)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موازنہ کا وہ مسودہ نامکمل تھا اور ابھی تمہید لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، علامہ شبلی نے جب اسے ہر طرح سے مکمل کر لیا تو تمہید کے ساتھ ۱۹۰۷ء میں شائع کیا۔

مضمون نگار نے مخطوطہ سے علامہ شبلی کے حک و اصلاح کی متعدد مثالیں نقل کی ہیں، جس کا پہلا نمونہ یہ ہے:-

> ”اس کی پہلی سطر“ شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی اور یہی ہونا چاہئے تھا“ مولانا نے سرخ قلم سے ”یہی ہونا چاہئے تھا“ کو کاٹ کر لکھا ”اقتصادی ضرورت تھی۔“ (۷)

اب اگر اس کو ملا کر پڑھیں تو عبارت یہ ہوگی ”شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی اور

یہی اقتصادی ضرورت تھی۔" ظاہر ہے اس تحریر کو صحیح قرار دینا علامہ شبلی کی روح کو تکلیف پہنچانا ہے، بہرحال قطعی خیال یہی ہے کہ فیضان صاحب نے جسے اصل مخطوطہ قرار دے کر طرح طرح کی رائے زنی کی ہے اور جس سے موازنہ کی حیثیت مجروح ہوتی ہے، وہ دراصل موازنہ انیس و دبیر کا پہلا نا تمام اور ناقص مسودہ ہے، اصل موازنہ انیس و دبیر وہی ہے جسے علامہ شبلی نے ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع کیا تھا، چونکہ اسی نسخہ کو تصحیح و مراجعت کے بعد ۲۰۰۴ء میں دارالمصنفین نے شائع کیا، اس لئے یہی سب سے معتبر اور محقق ہے۔

حوالے

(۱) ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ، فروری ۲۰۰۸ء ص ۲۰-۲۱

(۲) موازنہ انیس و دبیر دیباچہ طبع جدید ۱۱-۱۲

(۳) حیات شبلی ص ۳۸۲

(۴) ایضاً

(۵) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۱۶ء ص ٦٠

(٦) ماہنامہ الرشاد، فروری ۲۰۰۸ء ص ۲۱

(۷) ایضاً



اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

(بعض اعتراضات کا جائزہ)

"یہ جوابی مضمون ایک برس پہلے لکھا گیا تھا اور اسی وقت مضمون نگار نے اسے میرے حوالے کرنا چاہا تھا مگر میں نے چاہا کہ یہ ماہنامہ جامعہ دہلی ہی میں شائع ہو" قصہ زمین برسر زمین" مگر جب ایک برس تک انتظار کے بعد بھی جامعہ میں نہیں شائع ہو تو اب" معارف" میں شائع کیا جارہا ہے تا کہ اہل علم کو معلوم ہو کہ ایک بڑے ادارے کے ایک بڑے ذمہ دار نے کچھ" مصالح" کی بنا پر کیسی ناانصافی کی ہے، اورنگ زیب تو مظلوم تھا ہی اب اس کی جائز حمایت کے جرم میں شبلی بھی مظلوم ہو گئے، یا للعجب۔" (ضیاء الدین اصلاحی، معارف جولائی ۲۰۰۶ء)

انگریز مورخوں نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے، ان میں سب سے زیادہ عالمگیر کو ہدف تنقید و تنقیص بنایا اور اس کی شخصیت کو مطعون و مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، علامہ شبلی کے الفاظ میں:

"اس کی فرد قرارداد جرم اتنی لمبی ہے کہ شاید کسی مجرم کی نہ ہوگی، باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹا دیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھائے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری سلطنت کے ارکان متزلزل کر دئے۔(۱)

علامہ شبلی جن کا مطمح نظر اغلاط تاریخی کی تصحیح اور نئی جہتوں کی رہنمائی سے عبارت تھا اس

اتہام سے کبیدہ خاطر ہوئے چنانچہ معتبر تاریخوں سے ان الزامات کی تردید کی اور واضح کیا کہ عالمگیر پر عائد الزامات قطعی بے بنیاد اور بے سروپا ہیں۔

علامہ شبلی کی اس بلند پایہ تاریخی کاوش کی عظمت کا علی العموم اعتراف کیا گیا تاہم بعض اہل قلم نے اس پر اعتراضات بھی وارد کئے ہیں جن میں ایک اہم نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے جو علامہ شبلی ہی کے فیض یافتہ ہیں۔

مولانا آزاد نے فٹ نوٹ کی شکل میں جو اعتراضات کئے تھے اسی کو مدنظر رکھ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تاریخ وثقافت کے سابق صدر جناب سید عزیز الدین حسین ہمدانی نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں مولانا آزاد کے اشکالات کو مزید واضح کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کا لب ولہجہ ادعائی اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

> ''مولانا شبلی نعمانی نے اورنگزیب پر مضامین لکھے تا کہ اورنگزیب کی پالیسیوں کا صحیح طور پر تجزیہ کیا جاسکے، یہ ایک خوش آئند قدم تھا، لیکن شبلی بجائے مورخ کے اورنگزیب کے وکیل بن گئے اور نتیجتاً اپنے جذبات پر قابو نہ رکھتے ہوئے انھیں خامیوں کا شکار ہوگئے جس کے شکار خود انگریز اور انگریز نواز ہندوستانی مورخین تھے، شبلی نے شروع ہی میں لکھ دیا کہ ان کا اس کتاب کے لکھنے کا مقصد اورنگزیب کی طرفداری کرنا ہے جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنی حیثیت کو بحیثیت مورخ ختم کرلیا، اس لئے کہ مورخ کا کام حقائق کا تجزیہ کرنا ہے نہ کہ طرفداری۔ (۲)

ہمدانی صاحب کا یہ نقطہ نظر اس لئے بے بنیاد ہے کہ اگر کسی کی ذات کو ناروا طور پر مطعون ومجروح کیا جائے تو کیا اس کی تصحیح وتردید کی صورت میں جوابی الزام کے طور پر اسے ''وکیل'' قرار دیا جائے گا اور جذبات پر قابو نہ رکھنے کا الزام عائد ہوگا، ایک مورخ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بے بنیاد الزامات کی تصحیح کرے اور یہ اس کی تاریخی دیانت داری ہوگی، چنانچہ عالمگیر پر عائد الزامات کی تردید علامہ شبلی نے محض تاریخی حقائق کی وضاحت کے طور پر کی

ہے، سید شریف الحسن نقوی لکھتے ہیں:-

"شبلی نے محض اورنگزیب کے اسلامی عقائد سے متاثر ہو کر اس کی طرفداری نہیں کی ہے بلکہ تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اورنگزیب پر لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد ہیں۔"(۳)

ہمدانی صاحب کا یہ دعویٰ کہ شبلی نے اس کتاب کا مقصد تالیف اورنگزیب کی طرفداری قرار دیا ہے، صراحۃً حق و دیانت کے خلاف ہے علامہ شبلی تو ایک غیر جانب دار مورخ کی حیثیت سے یوں رقم طراز ہیں:-

"بے شبہ ہم کو نہایت ٹھنڈے دل سے بے رو رعایت ان جرائم کی تحقیقات کرنی چاہئے اور نہایت احتیاط رکھنا چاہئے کہ میزان عدل کا پلہ طرفداری کے رخ نہ جھک جائے۔"(۴)

شاہ جہاں اور عالم گیر کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میرا دل دکھتا ہے کہ ان میں کسی کو ملزم ٹھہراؤں لیکن سچائی اور تاریخ نویسی کا کیا فرض ہے شاہ جہاں اور عالمگیر دونوں قابل ادب ہیں لیکن دونوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے حق و راستی اور مجھ کو اسی اعلیٰ تر چیز کے سامنے گردن جھکا دینی چاہئے۔"(۵)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمدانی صاحب نے شبلی کی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ ان کے پیش نظر محض حواشی ابوالکلام میں نقل کئے گئے شبلی کے وہ اقتباسات ہیں جو جناب سید مسیح الحسن نے وضاحت کے طور پر نقل کئے ہیں۔

انگریز مورخین اور ان کے ہم نوا ہندوستانی مورخین نے عالمگیر اور عہد عالمگیر کی تاریخ کو جس طرح مسخ کیا ہے اور جس قدر عالمگیر کی تصویر کشی اور کذب و افترا سے کام لیا ہے اس کو پڑھ کر کوئی بھی حق پسند صاحب نظر غیض و غضب کا شکار ہو سکتا ہے، علامہ شبلی تو حد درجہ ذکی الحس تھے چنانچہ وہ اپنے ان احساسات کا اظہار یوں کرتے ہیں:-

"یورپین مورخین ایک اعتراض کے بیان کرنے میں جو خود غلط ہوتا ہے پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے چلے جاتے ہیں، جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو اسے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے وہ ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے مسلسل دروغ بیانی اور افتراؤں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آجاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو غصے سے بے قابو ہو جاتا ہے، خود مجھ پر بھی یہی اثر پڑا، لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش وغضب سے فائدہ اٹھائیں۔" (۶)

گویا انھوں نے شعوری طور پر جذبات پر قابو رکھتے ہوئے یہ مضامین لکھے جب کہ طیش وغضب کا بہت حد تک امکان تھا، اس کے بعد بھی جذبات پر قابو نہ رکھنے کا الزام کس درجہ بے معنی ہے؟

ہمدانی صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ نے اپنے مضامین میں تاریخ وار سلسلہ واقعات کا قطعی خیال نہیں رکھا جو اس کتاب کا ایک بڑا نقص ہے (۷)، انھوں نے ثبوت میں ایک فہرست بلحاظ سن پیش کی ہے (۸)۔ مگر خود انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ علامہ شبلی کی اس کتاب کا موضوع عہد عالمگیر کی سلسلہ وار تاریخ نہیں، بلکہ ان اعتراضات کا جائزہ ہے جو عالمگیر پر عائد کئے جاتے ہیں ایسی صورت میں اعتراضات کی نوعیت کے اعتبار سے ترتیب کا قائم کرنا ہی موضوع کے ساتھ انصاف ہے، ہمدانی صاحب محض اعتراض کرنے کے شوق میں اس قدر واضح حقیقت نہیں سمجھ سکے۔ جہاں تک حقائق کے تجزیے کی بات ہے معمولی سے معمولی شخص بھی شبلی کی اس کتاب میں ان کے تحقیق وتجزیے کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

متعصب مورخین کا یہ الزام ہے کہ عالمگیر نے شیوا جی کا شایان شان استقبال نہیں کیا ورنہ وہ اس کا مطیع اور فرماں بردار ہو جاتا، علامہ شبلی اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"شیوا جی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا، شاہی فوجوں نے اس

کے تمام علاقے فتح کر لئے تھے، وہ قلعہ میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا، اس
کے خاص صدر نشیں قلعے کے برجوں پر شاہی فوج کا پھریرا اڑ چکا تھا، ان
مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا اور دربار میں روانہ کیا گیا
تاہم اس کے استقبال کے لئے عالمگیر نے دربار میں سب سے زیادہ جو شخص
موزوں ہو سکتا تھا اس کو بھیجا، پنج ہزاری امراء کی صف میں جو خود راجہ جے سنگھ کا
منصب تھا اس کو جگہ دی اس سے زیادہ وہ اور کیا چاہتا تھا؟ کیا شہنشاہ ہند ایک
مفتوح رہزن کے لئے تخت سے اتر آتا؟ بے شبہ یورپ اس قسم کی جھوٹی اور
مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کر سکتا ہے لیکن اسلام سے اس کی توقع نہیں
رکھنی چاہئے۔" (۹)

مولانا آزاد نے حاشئے میں یہ لکھ کر کہ گویا اعمال عالمگیر، اعمال نفس اسلام تھے (۱۰)
ایک طنز کیا ہے اور اسی بات کو ہمدانی صاحب نے زیادہ واضح طور پر لکھا ہے کہ دراصل یہ سمجھ صرف
شبلی ہی کی نہیں بلکہ عام طور سے مورخین کی بھی ہے کہ اورنگزیب نے کامل طور پر اسلام کی پیروی
کی (۱۱)۔ حالانکہ معاملہ محض یہ ہے کہ تاریخ نگاری میں اصل واقعہ اور استنباط نتائج دو علاحدہ
چیزیں ہیں، علامہ شبلی نے اصل واقعہ یعنی شیواجی کے استقبال کا ذکر کرنے کے بعد استنباط نتائج
میں "اسلام" کو پیش کیا ہے، وجہ ظاہر ہے اور سیاق وسباق بھی شہادت دیتے ہیں کہ شبلی انگریز
مورخین جو ہندوستان میں عیسائیت کے علمبردار تھے ان کا جواب دے رہے ہیں اور عیسائیت کے
مقابلے میں شبلی اسلام ہی کو پیش کر سکتے تھے اس سے اعمال عالمگیر اور نفس اسلام میں قدر مشترک
پیدا کرنا نہ صرف شبلی کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ تاریخی دیانت کے بھی خلاف ہے۔

سنبھا کی باغیانہ حرکتوں کے خلاف کاروائی ہوئی اور وہ گرفتار کیا گیا اور چونکہ اس نے
عالمگیر کو درودرشت گالیاں دیں، عالمگیر نے اس کی زبان کاٹنے کا حکم دیا اور پھر آنکھیں نکلوا کر
قتل کرادیا، علامہ شبلی نے اسے عالمگیر کی پچاس سالہ حکومت میں ایک مستثنیٰ واقعہ قرار دیا ہے
(۱۲)۔ مولانا آزاد نے اس پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ یہ ہے:-

"اگرچہ عرق پوست پلا پلا کر زندانیان گوالیار کو ہلاک کرتا رہا، اسلام نے تو ہر حال میں مثلہ کو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن یہ مقدس ولی مغلوب ومحکوم دشمن کی زبان کٹواتا ہے اور آنکھیں نکلواتا ہے۔" (۱۳)

علامہ شبلی نے زبان کٹوانے اور آنکھیں نکلوانے کے واقعہ کو وحشت ناکی کے لحاظ سے ایک مستثنیٰ واقعہ قرار دیا ہے، یہ عام تعزیراتی عمل قطعی نہیں تھا، یہاں مثلہ کی بحث بھی بے جا ہے، مولانا آزاد نے یہاں بھی سنبھا کی سزا کو اسلام سے جوڑنے کی کوشش کی ہے حالانکہ علامہ شبلی نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ عالمگیر کی سلطنت میں پورے طور پر شریعت کے قوانین پر عمل کیا جاتا تھا، ہمدانی صاحب کو شکایت ہے کہ:-

"شبلی عالم ہونے کے ساتھ نہ معلوم کیوں اورنگزیب کے معاملہ میں اپنے جذبات میں اس قدر بہہ جاتے ہیں کہ ان کو اورنگزیب کا کوئی عمل غیر شرعی محسوس نہیں ہوتا۔" (۱۴)

یعنی شبلی کو جذبات پر قابو رکھتے ہوئے شرعی اور غیر شرعی کی بحث کرنی چاہئے تھی اور دکھلانا چاہئے تھا کہ عالمگیر کا کون سا فعل شریعت کے مطابق تھا اور کون غیر شرعی، یہ کس قدر عقل کے خلاف ہے کہ اولاً کسی واقعہ کو اسلام سے جوڑا جائے اور پھر یہ بے جا توقع کی جائے کہ شبلی کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔

سنبھا کے ساتھ اس کی ماں اور بیٹا ساہو بھی گرفتار ہوئے تھے قید میں ان کے ساتھ عالمگیر نے حسن سلوک سے کام لیا، ہفت ہزاری منصب اور راجہ کا خطاب دیا، اس کی سرکار قائم کی، اس کا ~~خیمہ~~ شاہی خیمے کے ساتھ ایستادہ کرایا۔ عالمگیر کے اس برتاؤ پر مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ "کیا اس سے الفنسٹن کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی کہ عالمگیر نے مرہٹوں کے ساتھ بالآخر وہ کیا جو ان کی توقع سے بھی زیادہ تھا اگر سخت مجبوری نہ ہوتی تو اس درجہ تالیف قلب ممکن نہ تھی۔ (۱۵)

سنبھا کو سخت سزا دی جائے تو مولانا آزاد چیں بہ جبیں اور ساہو کے ساتھ حسن سلوک

ہوتو انگریز اور عیسائی مورخ الفنسٹن کی رائے کی تائید وتصدیق، اسے اعتراض برائے اعتراض کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

شاہ جہاں سے عالمگیر کی کسی بغاوت کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا جس میں مراٹھوں نے عالمگیر کا ساتھ دیا ہو مگر ہمدانی صاحب نے اس کا انکشاف کیا ہے (جامعہ ص ۱۸۴) حیرت ہے کہ اس کا ذکر برنیئر نے بھی نہیں کیا، کاش ہمدانی صاحب حوالہ دیتے تو مطالعہ عالمگیر کا ایک نیا باب شروع ہوتا۔

راجہ جسونت سنگھ نے کئی بار وفاداریاں تبدیل کیں اور ہر بار عفوودرگذر کی درخواست عالمگیر کے دربار میں منظور ہوئی اس کی موت کے بعد راج پوتوں نے اس کے یک ماہہ بچے کو راجہ بنانے کی مانگ کی، عالمگیر نے جواب دیا کہ اس کو دربار میں بھیج دیا جائے سن شعور کو پہونچنے کے بعد اس کو منصب وغیرہ دیدیا جائے گا لیکن راجپوتوں نے جواب کا انتظار تک نہ کیا اور بچے کو لے کر فرار ہوگئے، مولانا آزاد نے اس موقع پر یہ سوال قائم کیا ہے کہ اگر کوئی مخالفانہ عزم وعمل عالمگیر کا نہ تھا تو کارپردازان جسونت سنگھ نے بچوں کو کیوں حوالہ نہیں کیا اور ابتداء سے مخالفانہ رویہ کیوں دکھلایا۔" (۱٦)

علامہ شبلی کے بقول کارپردازان جسونت سنگھ دربار عالمگیر کے جواب سے پہلے بچے کو لے کر فرار ہوگئے، ہمدانی صاحب کا کہنا ہے کہ عالمگیر نے جودھ پور کی گدی جسونت سنگھ کے بیٹے اجیت سنگھ کو دینے سے انکار کردیا تھا اس لئے راٹھوروں نے بغاوت کی اور شبلی پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ شبلی تو حقائق کو اس طرح بیان کرتے ہیں جس سے دوسرا ہی قصوروار ٹھہرے۔ (۱۷)

ممکن ہے علامہ شبلی کا بیان درست نہ ہو لیکن یہ تو طے ہے کہ بار بار کے عفوودرگذر کے باوجود راجہ جسونت سنگھ کی بیوی رانی ہاڈی اورنگزیب مخالف تھی، اسے بقول ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد جودھ پور پر مغلوں کا تسلط تسلیم نہیں تھا اور وہ جودھ پور کو راٹھوروں کا وطن قرار دیتی تھی اس لئے اس نے عالمگیر کی سپاہ اور امداد قبول نہیں کی (۱۸)، یہی وجہ تھی کہ عالمگیر نے اندر سنگھ کو جودھ پور سے ۲۷ لاکھ روپیہ لے کر ٹیکس وصول کرنے کا ٹھیکہ دیدیا، بعد میں اجیت سنگھ کو

دو پرگنے سوجت اور جیتا کھ بطور جاگیر دئے (۱۹)۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمگیر نے یک ماہہ بچے کو سن شعور تک پہونچنے کے بعد راجہ بنانے کی مانگ قبول کر لی تھی، علامہ شبلی نے اسی کو پیش نظر رکھ کر کارپردازان جسونت سنگھ کو قصور وار ٹھہرایا ہے، اس سے کہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ شبلی نے بالقصد حقائق کو دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔

داراشکوہ کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ وہ علانیہ ہندوپن کا اظہار کرتا تھا اپنشد کے ترجمہ میں اس نے لکھا ہے کہ قرآن مجید اصل میں اپنشد میں ہے (۲۰)، مولانا آزاد نے اس عبارت سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ علامہ شبلی داراشکوہ کو ملحد قرار دیتے ہیں پھر اس پر یوں معترض ہیں کہ "اس میں کیا الحاد ہے اگر اپنشد سرچشمہ بحر توحید ہے قول دارشکوہ ہے اور مطالب قرآن سے متحد تو یقیناً و ماانزل من قبلک میں داخل ہے اور قرآن مثل توراۃ وانجیل اس کا مصداق" (۲۱)، مگر مولانا آزاد کی یہ توجیہ خود محل نظر ہے اور داراشکوہ کے نقطہ نظر کی خوبصورت تاویل ہے، اپنشد کے ترجمہ داراشکوہ کا ایک قلمی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے، جس کے سر ورق پر ہندوانہ رسوم کا گہرا نقش ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ وحدت ادیان کے فلسفہ کو اس کے ذریعہ پیش کرنا چاہتا تھا، مولانا آزاد نے معلوم نہیں کن مجبوریوں کے تحت اس کے فلسفہ وحدت ادیان کو تورات وانجیل سے جوڑ دیا ہے۔

ہمدانی صاحب نے چند اور مثالیں بھی پیش کی ہیں اور داراشکوہ کے متعلق محضر الحاد پر ایک عالم مولوی محمد یعقوب کے دستخط نہ کرنے اور ان کے اس قول سے کہ "مجھ کو داراشکوہ کے الحاد کا علم نہیں" مولانا آزاد کے موقف کی تائید کرنے کی کوشش کی ہے، اور عہد عالمگیر کے علماء پر عالمگیر کی ہم نوائی اور ماتحتی کا الزام عائد کیا ہے اور عالمگیر مخالف پشتو شاعر خوش حال خاں خٹک کے اشعار سے اس دور کے علماء کی چاپلوسی اور شریعت کے خلاف ان کی سرگرمیوں پر استدلال کیا ہے اور یہ سوال کیا ہے کہ داراشکوہ کی تدفین مقبرہ ہمایوں میں ہوئی، کیا فتویٰ الحاد کے بعد ایک ملحد و مرتد کی تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں شرعاً جائز تھی (۲۲)۔ حالانکہ دارا کا قتل جیسا کہ معاصر تاریخوں کی شہادت ہے سیاسی قتل تھا نہ کہ مذہبی۔ (۲۳) خود علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

''تیموری خاندان بلکہ تمام ایشیائی سلطنتوں میں مدعیان سلطنت قید اور نظر بند ہو کر بھی سلطنت کے منصوبوں سے دست بردار نہیں ہوتے ،اس کے ساتھ ان کے طرفداروں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور وہ اس وقت تک نچلا نہیں بیٹھ سکتا جب تک نخل آرزو کے تمام رگ و ریشے کٹ نہ جائیں...... یہ قطعی ہے کہ دارا شکوہ جب تک زندہ رہتا سازشیں برپا رہتیں اور ملک کو امن و امان نصیب نہ ہوتا اس لئے عالمگیر کو وہی کرنا پڑا جو خود اس کے باپ شاہجہاں سے اس کو ترکہ میں ملا تھا۔'' (۲۴)

دارا شکوہ کے الحاد کے سلسلے میں علما اور مورخین کے درمیان اختلاف ممکن ہے مگر اس کے علانیہ ہندوپن کے اظہار میں جیسا کہ خود علامہ شبلی نے لکھا ہے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے عام طور سے مورخین اس کا ذکر کرتے ہیں، منشی محمد ذکاءاللہ دہلوی لکھتے ہیں:-

''دارا شکوہ ہندوؤں کے دین اور آئین کی طرف مائل تھا، برہمنوں اور جوگیوں اور سنیاسنوں کے ساتھ صحبت رکھتا تھا اور ان کو مرشد کامل اور عارف بحق واصل سمجھتا تھا اور ان کے وید کی کتاب کو آسمانی و خطاب ربانی جانتا تھا اور اس کو مصحف قدیم و کتاب کریم خیال کر کے پڑھتا تھا اور کمال اعتقاد کے سبب سے اس نے اطراف سے سنیاسی اور برہمن بڑی سعی سے جمع کئے تھے اور وید کا ترجمہ کرتا تھا اور ہمیشہ اسی کام میں اپنے اوقات صرف کرتا تھا اور بجائے اسماء حسنائے الٰہی کے پربھو جس کو ہندو اسم اعظم جانتے ہیں، ہندی خط میں الماس و یاقوت و زمرد وغیرہ کے نگینوں پر نقش کرا کے پہنتا تھا اور ان کو متبرک جانتا تھا وہ اس کا معتقد تھا کہ ناقصوں کے واسطے تکلیف عبادت ہے اور عارف کامل کو عبادت درکار نہیں اور اس کی دلیل آیت کریمہ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین اس کی دلیل بتلاتا تھا اس لئے اس نے نماز، روزہ اور کل تکالیف شرعیہ کو خیر باد کہا۔'' (۲۵)

جہاں تک داراشکوہ کے مقبرہ ہمایوں میں تدفین کا معاملہ ہے، اس سلسلہ میں اسلام کا جو موقف ہے وہ ظاہر ہے عالمگیر کو اگر اس کا علم ہوتا تو اس کی افتاد طبع کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً دارا کی تدفین مقبرہ ہمایوں میں نہ ہوتی، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمگیر کا ہر عمل شریعت کے مطابق نہ تھا، علامہ شبلی نے بھی کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ہے، باوجود اس کے علامہ شبلی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عالمگیر کے ہر فعل و عمل پر شرعی نقطہ نظر سے بحث کریں، کیا یہی تاریخی دیانت داری ہے۔

علامہ شبلی نے مراد کی گرفتاری اور پھر اس کی موت پر محققانہ اور مورخانہ انداز میں بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

> "اصل واقعہ یہ ہے کہ مراد گو نہایت دلیر، بہادر اور جاں باز تھا لیکن اس کے ساتھ نہایت سادہ لوح اور آسانی سے لوگوں کے دام میں آجاتا تھا داراشکوہ پر جب اس کو فتح حاصل ہو چکی تو اب اس کو لوگوں کے بہکانے سے یہ خیال آیا کہ یہ معرکے میں نے سر کئے ہیں میں ہی تنہا تخت سلطنت کا حق دار ہوں، اس خیال سے اس نے عالمگیر سے علاحدگی اختیار کی اور عالم گیر کے بڑے بڑے امرا کو بھاری تنخواہوں اور انعاموں کی طمع دلا کر توڑنا شروع کیا چنانچہ بیس ہزار فوج اس کے رکاب میں جمع ہو گئی اور روز بروز عالمگیر کی فوج گھٹتی جاتی تھی، مجبوراً عالمگیر کو اس کا بندوبست کرنا پڑا۔" (۲۶)

عالمگیر نے مراد کا جس طرح بندوبست کیا خود علامہ شبلی کو بھی وہ پسند نہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "گو مراد سے علانیہ جنگ کرنے میں ہزاروں کا خون ہوتا لیکن اگر عالمگیر اور خوں ریزیوں کی طرح اس کو بھی گوارا کرتا اور مراد پر تدبیر سے نہیں بلکہ شمشیر سے قابو پاتا تو ہم اس کی مردانہ روش کی زیادہ داد دیتے، لیکن سچ یہ ہے کہ عالمگیر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خلیفہ منصور عباسی سے جس نے ابو مسلم اصفہانی بانی دولت عباسیہ کو دھوکے سے قتل کرادیا تھا زیادہ مدح کا مستحق

ہے۔"(۲۷)

علامہ شبلی کی اس قدر وضاحت کے بعد بھی مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ:۔

"تخت سلطنت کے لئے جو کشاکش شاہجہاں کے بیٹوں کے درمیان واقع ہوئی اس کی تفصیل شبلی نے مراد کی گرفتاری کا قصہ بیان کر کے ختم کر دی ہے۔"(۲۸)

ہمدانی صاحب مولانا آزاد کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ صحیح سوال آزاد نے اٹھایا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شبلی کے ذہن میں یہ بات رہی ہوگی کہ اگر ان معاملات کو چھیڑا تو پھر بات ہاتھ سے نکل جائے گی اور اورنگزیب کی مدافعت نہ کر پائیں گے۔"(۲۹)

آخر وہ کون سے معاملات تھے جن کو شبلی چھیڑتے تو بات ہاتھ سے نکل جاتی، ہمدانی صاحب کم از کم اس کی ایک مثال تو پیش کر دیتے، دعویٰ کے لئے ثبوت ضروری ہے۔

عالمگیر کے تعلق سے ایک اہم بحث جزیہ کی ہے علامہ شبلی نے چونکہ جزیہ پر علاحدہ ایک مفصل رسالہ لکھا تھا (۳۰) اس لئے مختصراً لکھ دیا کہ جزیہ کوئی ناگوار چیز نہ تھی بلکہ غیر قوموں کے حق میں ایک رحمت تھی، لیکن سچ ہے کہ ہندوؤں نے اس پر ناراضگی ظاہر کی، بات صرف اتنی تھی کہ اس سے پہلے جزیہ اکبر نے موقوف کر دیا تھا اس لئے دوبارہ اس کے نفاذ پر ناگواری کا اظہار ہوا۔(۳۱) جزیہ کی بحث پر مولانا آزاد نے شبلی کی جس بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے۔(۳۲) وہ درست نہیں اس لئے کہ علامہ شبلی نے اس موقع پر صراحت کر دی ہے کہ جزیہ پر ایک مفصل رسالہ لکھا جا چکا ہے۔اب ہمدانی صاحب کے خیالات ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتے ہیں:

"عجیب بات یہ ہے کہ شبلی دو اور اہم کتابوں کے بھی مصنف ہیں جن کا تعلق جزیے ہی سے ہے، یعنی حقوق الذمیین اور الجزیہ، لیکن جب اورنگزیب کی جزیہ کی پالیسی پر لکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس الفاظ ہی نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی نے جو کچھ ان دو کتابوں میں لکھا وہ اورنگزیب کے

اقدامات کے منافی تھا۔" (۳۳)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ علامہ شبلی نے صراحت کر دی ہے کہ جزیہ پر ایک علاحدہ رسالہ لکھا جا چکا ہے، ہمدانی صاحب نے اس صراحت کا یہ مفہوم طے کیا ہے کہ شبلی کے پاس اورنگزیب کی جزیہ کی پالیسی پر لکھنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں، پھر اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں شبلی نے جو کچھ لکھا تھا وہ اورنگزیب کے اقدامات کے منافی تھا گویا شبلی نے شعوری طور پر صرف نظر کیا ہے، یہی مولانا آزاد کا بھی قیاس ہے، اس بحث میں بھی مرعوبیت کا عنصر غالب ہے۔

عالمگیر نے میلوں ٹھیلوں کو بند کرادیا تھا اس کا سبب بھی مورخین یورپ کو مذہبی تعصب ہی نظر آیا مگر علامہ شبلی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ عالمگیر کا یہ عمل مذہبی تعصب کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا تھا، نیز فساد و بلوہ وغیرہ کا بھی خطرہ رہتا تھا اس لئے عالمگیر نے اسے بند کرادیا یہ محض علامہ شبلی کا اندیشہ ہی نہ تھا بلکہ انھوں نے اس کی یہ مثال بھی دی ہے کہ ۱۰۷۹ھ کے جلوس میں تابوت کے گشت کو لے کر برہان پور میں بلوہ عظیم ہوا، جس میں بڑی خوں ریزی ہوئی، چنانچہ عالمگیر نے تابوت نکالنے پر پابندی عائد کر دی، عالمگیر کی افتادِ طبع کو بھی اس میں دخل تھا وہ طبعاً خشک اور روکھا پھیکا شخص تھا، اسے میلوں ٹھیلوں، شراب، کباب، ناچ گانے اور ظاہری نمائش و تکلفات سے سخت نفرت تھی غرض یہ کہ ان امور کی پابندی میں مذہبی تعصب کے بجائے نظم و انتظام کو دخل تھا۔ (۳۴)

مولانا آزاد نے عالمگیر کی اس روش پر اعتراض کیا ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی میلوں کو بند کرنے کا شرعاً و قانوناً اس کو کوئی حق نہ تھا، مذہبی اور اخلاقی اصلاح صرف مسلمانوں کے لئے تھی نہ کہ ذمیوں کے لئے۔ (۳۵) حالانکہ ان اصلاحات کا تعلق نقض امن سے تھا اور کون انکار کرسکتا ہے کہ امن و امان کا قیام ہر فرمانروا اور ہر حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے اس سلسلے میں مسلم اور ذمی کی بحث غیر ضروری اور غیر منطقی ہے۔

علامہ شبلی نے حقوق الذمیین میں اس پر بحث کی ہے اس کے باوجود ہمدانی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"شبلی بھی اپنی دوسری کتاب حقوق الذمیین میں یہی لکھتے ہیں کہ ذمیوں کو اپنے تیوہار وغیرہ منانے کی پوری پوری آزادی ہوگی اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شبلی جب اورنگزیب پر لکھتے ہیں تو وہ پیانے ان کے سامنے نہیں رہتے کیوں کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہوتا تو پھر اس طرح کے بیانات دیتے ہیں تاکہ مسئلے کو ٹالا جاسکے اور جو مسلم قارئین اس کو پڑھیں گے تو ظاہر ہے وہ ایک عالم کی بات پر آمنا وصدقنا ہی کریں گے۔" (۳۶)

یہاں سرے سے ذمی اور غیر ذمی کی بحث ہی نہیں ہے بلکہ معاملہ محض امن وامان کے قیام کا ہے، ذمی کا معاملہ شبلی کے بجائے مولانا آزاد نے اٹھایا ہے، اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ جس کا ذکر سارے فسانے میں نہ تھا وہ بات ہمدانی صاحب کو بہت ناگوار گذری ہے، دراصل ہمارے معترضین کا تاریخی شعور ناپختہ ہے، ورنہ وہ اس حقیقت کے اظہار وقبول میں دور دراز کی تاویلیں نہ کرتے۔

عالمگیر پر ایک بڑا الزام بت شکنی اور مندر توڑنے کا ہے جس کی مغربی مورخین نے اس زور سے تشہیر کی کہ آج تک فضا پر شور ہے، علامہ شبلی نے اس اہم الزام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس نے ان ہی مندروں کو برباد کیا تھا جہاں بغاوتوں کی سازشیں کی جاتی تھیں، مغربی مورخین اور ان کے زیر اثر بعض ہندوستانی مورخین نے اس سچائی کا رخ اس طرف موڑ دیا کہ مندر توڑے گئے اس لئے بغاوتیں ہوئیں (۳۷) جس کا ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا (۳۸) علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

"جس قدر بت خانے توڑے گئے ان ہی مقامات کے توڑے گئے جہاں پر زور بغاوتیں برپا ہوئیں، عالمگیر پچیس برس تک دکن میں رہا ان ممالک میں ہزاروں بت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانے کو ہاتھ بھی لگایا ہو، الورہ کے مشہور مندر میں

سیکڑوں تصویریں اور بت ہیں، عالمگیر اسی نواح میں میل دو میل کے فاصلے پر
مدفون ہے بڑے بڑے بزرگان دین کا یہاں مزار ہے جو عالمگیر سے بہت
پہلے گذرے ہیں لیکن یہ بت اور تصویریں آج تک موجود ہیں۔" (۳۹)

علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں جو ناقابل تردید دلائل بیان کئے ہیں دور حاضر کے بعض اہم مورخین نے بھی ان کی صداقت کو تسلیم کیا ہے ان کا خیال ہے کہ عالمگیر نے صرف مندر ہی نہیں توڑے بلکہ بغاوتوں کی زد میں آنے والی مساجد بھی مسمار کیں۔ (۴۰) لیکن ہمدانی صاحب فرماتے ہیں:-

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی عہد اورنگزیب کے ماخذ کا مطالعہ کئے بغیر
صرف اورنگزیب کے ہر قدم کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرتے
رہے ہیں دوسرے ان بیانات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی کے ذہن میں
عہد اورنگزیب کی تاریخ وار ترتیب ہے ہی نہیں، بغاوت بعد میں ہوئی مندر
پہلے توڑا گیا۔" (۴۱)

علامہ شبلی اپنے موقف کی تائید میں دلائل پیش کرتے ہیں حوالے دیتے ہیں ظاہر ہے یہ بغیر ماخذ کے مطالعے کے ممکن نہیں پھر بھی ہمدانی صاحب کو محسوس ہوتا ہے کہ شبلی عہد اورنگزیب کے ماخذ کا مطالعہ کئے بغیر اورنگزیب کے ہر قدم کو صحیح ٹھہراتے ہیں تو ان کے احساس کو کون سا نام دیا جائے اور خود ہمدانی صاحب اپنے کو دلائل و براہین سے بالاتر سمجھتے ہیں اور کوئی حوالہ نہیں دیتے اور نہ مثال پیش کرتے ہیں محض الزامات عائد کرتے ہیں، یہ تاریخ اور تجزیہ کا طریقہ نہیں بلکہ غیر علمی اور غیر مورخانہ انداز تحریر ہے جسے کسی طرح درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مولانا آزاد نے ایک دو جگہ واضح طور پر علامہ شبلی کی تاریخ نگاری پر تنقید کی ہے مثلاً علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ دارا شکوہ نے یہ مشق بہم پہونچائی تھی کہ شاہ جہاں کے خط سے اپنا خط ملا دیتا تھا اور فرامین پر شاہ جہاں کے دستخط اپنے ہاتھ سے بناتا تھا (۴۲) اس کے حاشیہ میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ کیا منصفانہ تاریخ نویسی ہے کہ مراد جو خود ایک فریق ہے اور دارا شکوہ

کا دشمن اس کے قول کی سند لائی جاتی ہے (۴۳)۔ علامہ شبلی کو بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ان موقعوں پر مراد کا بیان اس لئے نہایت وثوق کے قابل ہے کہ وہ یہ واقعات عالمگیر کو لکھ رہا ہے اس لئے یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ عوام کو دھوکہ دینے کے لئے لکھتا ہو، مراد اور عالمگیر اس قت تک ہمراز اور ہمدرد ہیں۔'' (۴۴)

اب اس سلسلے میں ہمدانی صاحب کا خیال ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی نے شاہ جہاں کے دور کے کسی ایک فرمان کو بھی نہیں دیکھا، فرامین پر مغل بادشاہ دستخط نہیں کرتے تھے اور نہ کسی فرمان پر ان کے دستخط ملتے ہیں وہ صرف ایک صواد (؟) بناتے تھے، لہٰذا یہ الزام ہی سرے سے قطعی غلط ہے، مغل بادشاہوں کے دستخط تو بہت کم ملتے ہیں اور وہ بھی خاص مخطوطات پر۔'' (۴۵)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مغلوں کے فرامین کی پہچان کیا تھی اور کیسے تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ شاہی فرمان ہے، ہمدانی صاحب فرماتے ہیں کہ محض صاد بنا دیا جاتا تھا ممکن ہے مراد نے اسی کو دستخط خیال کیا ہو۔

دارا کے خط میں خط ملا دینے کا ذکر متعدد مورخوں نے کیا ہے رقعات و مکاتیب عالمگیر کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے بھی دارا کی اس حرکت کا ذکر کیا ہے۔ (۴۶) اور اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ شاہجہاں کی بیماری کے بعد سارے اختیارات دارا نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ شاہجہاں کی رائے کے برخلاف دارا نے فیصلے کئے اور فرمان جاری کئے، اس کی خودسری اور خودرائی سے بھی بعید نہیں کہ اس نے یہ حرکت کی ہو۔

جہاں تک شبلی کے فرامین دیکھنے کا معاملہ ہے یقیناً شبلی نے فرامین دیکھے تھے بلکہ انھوں نے بعض فرامین کی نمائش بھی کی تھی، عہد مغلیہ کے چند فرامین دارالمصنفین میں بھی موجود

ہیں، رہا معاملہ ان سے استدلال کا تو اس کی وجہ جیسا کہ اوپر درج کیا گیا علامہ شبلی نے خود ہی بیان کردی ہے، اس کے باوجود اعتراض چہ معنی دارد۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ عالمگیر فن موسیقی کا ماہر تھا لیکن چونکہ مزامیر کے ساتھ گانا بجانا شرعاً ممنوع ہے اس لئے اس نے اس صیغہ کو بند کردیا مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ کس شریعت میں ممنوع ہے اسلام میں تو نہیں۔

یہاں یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ شریعت کی بحث خود علامہ شبلی نے اٹھائی ہے، جس کے جواب میں مولانا آزاد نے ایک اور مسئلہ اٹھادیا ہے کہ موسیقی کس شریعت میں ممنوع ہے اسلام میں تو نہیں ہے، اس کے جواز وعدم جواز کا فیصلہ علما کی ذمہ داری ہے تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہاں شریعت کا حوالہ شبلی نے دیا ہے۔

دراصل الزامات عالمگیر کی تردید میں عہد و ماحول کا خیال رکھنا ضروری ہے، عالمگیر کا ابتدائی دور معرکہ آرائیوں میں گذرا اور جب اسے استحکام نصیب ہوا تو اس نے شریعت کے قوانین پر عمل درآمد کی کوشش کی، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کے ہر فعل وعمل کو شریعت کی میزان پر تولا بھی نہیں جاسکتا۔

دراصل مولانا آزاد کا ایک خاص نقطہ نظر تھا اور ان کی سیاسی مجبوریوں نے ان کے اس مطمح نظر کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی، شبلی پر ان کے اعتراضات کے جائزے میں اس مجبوری کا ادراک نامناسب نہین، لیکن ہمدانی صاحب شاید اس پس منظر سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آزاد کے خیالات کے ہم نوا ہیں حالانکہ تمام تاریخی شہادتیں مولانا آزاد کے موقف کے خلاف ہیں۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا ہے کہ اورنگزیب کے عہد سے متعلق بعد میں جو دستاویزات ملی ہیں اور جو اس وقت انھیں (علامہ شبلی کو) حاصل نہیں تھیں ان کی بنیاد پر کئی باتوں میں ان کی تردید کی جاسکتی ہے (۴۷) مگر وہ کوئی دستاویز پیش نہیں کرسکے اس لئے ان کا بیان علمی حیثیت سے باوزن نہیں، اس کے برعکس دور حاضر کے مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے

نہ صرف علامہ شبلی کے دلائل کی صداقت واضح ہوتی ہے بلکہ مزید دلائل بھی فراہم ہوتے ہیں۔(۴۸)

کسی کتاب اور مقالے پر بحث وتنقید میں اس کے عہد اور زمانہ تصنیف کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے، علامہ شبلی نے جس وقت یہ مضامین لکھے تھے اس وقت اس موضوع پر کسی ہندوستانی مورخ اور صاحب علم ونظر کی کوئی تحریر موجود نہیں تھی، ہمدانی صاحب نے اس کی اولیت اور اہمیت کا کہیں اعتراف نہیں کیا ہے۔

علامہ شبلی نے تاریخ نویسی میں سند اور حوالے پر بہت زور دیا ہے اور خود اس کا بہت اہتمام کیا ہے، بعض ان مقامات پر بھی حوالے دئے ہیں جہاں اگر وہ حوالے نہ بھی دیتے تو ان کے علم وفضل اور مورخانہ عظمت کی وجہ سے کوئی معترض نہ ہوتا۔لیکن ہمدانی صاحب اس دور جدید میں بھی خود کو اس سے بالاتر تصور کرتے ہیں، پورے مقالے میں کہیں بھی حوالہ نہ دینا کیا ظاہر کرتا ہے۔علامہ شبلی تو جن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں ان کے پایہ استناد پر بھی بحث کر دیتے ہیں اور ہمدانی صاحب ان پر تنقید کرتے ہیں اور حوالہ تک نہیں دیتے۔

حوالے:

(۱) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر-ص ۳، دارالمصنفین اعظم گڈھ طبع جدید ۱۹۹۹ء

(۲) جامعہ دہلی اپریل- جون ۲۰۰۵ء-ص ۱۸۰،

(۳) شبلی کی علمی وادبی خدمات-ص ۲۹۸، ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی- ۱۹۹۶ء

(۴) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر-ص ۷۵

(۵) ایضاً-ص ۸۵

(۶) ایضاً-ص ۴۵

(۷) جامعہ دہلی اپریل جون ۲۰۰۵ء-ص ۱۸۱

(۸) ایضاً

(۹) اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر-ص ۲۷

(۱۰) حواشی ابوالکلام آزاد-ص ۳۴۸، دہلی ۱۹۸۸ء

(۱۱) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء-ص ۱۸۲

(۱۲) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر-ص ۳۸

(۱۳) حواشی ابوالکلام آزاد-ص ۳۴۸-۳۴۹

(۱۴) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء-ص ۱۸۳

(۱۵) حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۴۸-۳۴۹

(۱۶) ایضاً ص ۳۵۰

(۱۷) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء-ص ۱۸۴-۱۸۵

(۱۸) ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، اورنگزیب ایک نیا زاویہ نظر ص ۵۴، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۰ء

(۱۹) ایضاً ص ۵۵

(۲۰) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۲

(۲۱) حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۵۰

(۲۲) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء-ص ۱۸۶

(۲۳) عالمگیر نامہ ص ۳۳۴، و مآثر عالمگیری ص ۲۷

(۲۴) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۹۲-۹۳

(۲۵) تاریخ ہندوستان ج ۸ ص ۷-۸ علی گڈھ ۱۹۱۷ء

(۲۶) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر، ص ۹۵

(۲۷) ایضاً ص ۹۶

(۲۸) حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۵۲

(۲۹) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء-ص ۱۹۱

(۳۰) مقالات شبلی ج ا ص ۲۲۱، دارالمصنفین اعظم گڈھ-۱۹۵۴ء

(۳۱) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۷
(۳۲) حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۵۰
(۳۳) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء - ص ۱۸۸
(۳۴) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۷-۶۸
(۳۵) حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۵۱
(۳۶) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء - ص ۱۸۹
(۳۷) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۷۳
(۳۸) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا ریاست علی ندوی، عالمگیر کے عہد میں مندروں کا انہدام (معارف فروری ۱۹۴۷ء)
(۳۹) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۷۳
(۴۰) اورنگزیب ایک نیاز اویہ نظر ص ۱۷
(۴۱) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء - ص ۱۸۹
(۴۲) اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۸۳
(۴۳) حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۵۱
(۴۴) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۸۳
(۴۵) جامعہ دہلی، اپریل جون ۲۰۰۵ء - ص ۱۹۰
(۴۶) سید نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۴۱۰، دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۹۳ء
(۴۷) ضیاء الحسن فاروقی، اشخاص وافکار ص ۲۷، مکتبہ جامعہ، دہلی
(۴۸) اورنگزیب ایک نیاز اویہ نظر ص ۵

☆☆☆

علامہ شبلیؒ بحیثیت مدیر

علامہ شبلیؒ (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) نے مدیر کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دئے اگرچہ گردش ایام نے ان کے نقوش دھندلے کر دئے ہیں، تاہم اس کا مطالعہ آج بھی دلچسپی اور فائدے سے خالی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں میں تحقیق و تدقیق، تلاش و تفحص اور مختلف علوم و فنون سے جو شیفتگی پیدا ہوئی اس میں بالواسطہ فیضان شبلی کا بڑا دخل ہے۔

اہل علم و دانش اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ شبلی کے ذوق تحقیق و تصنیف کو علی گڑھ نے پر پرواز عطا کی، سرسید اور آرنلڈ کی صحبت، کتب بینی کی سہولت اور علی گڑھ کی علمی فضا نے شبلی کے جذبہ تلاش و تفحص اور تصنیف و تالیف کو جلا بخشی، خود سرسید نے اپنا ذاتی کتب خانہ جو علم و تحقیق کا خزانہ تھا، شبلی کے لئے عام کر دیا تھا، علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ، عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں''۔(۱)

علی گڑھ میں علامہ شبلی کے تحقیقی کارناموں مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۱۸۸۷ء)، المامون (۱۸۸۷ء)، الجزیہ (۱۸۸۹ء)، کتب خانہ اسکندریہ (۱۸۹۲ء)، اور سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء) وغیرہ جیسی لازوال تحریروں اور محققانہ کاوشوں نے علامہ شبلی کی عظمت علم و تحقیق کو قبول عام کا درجہ عطا کر دیا تھا، چنانچہ ۱۸۹۴ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کے ضمیمہ محمڈن

اینگلواورینٹل کالج میگزین کو سرسید نے خالص علم وتحقیق سے عبارت کرنا چاہا تو ان کی نگاہ انتخاب شبلی پر پڑی اور انھیں اس کا اڈیٹر مقرر کیا گیا، خود مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

''قریباً چار برس ہوئے کہ اس نام کا ایک رسالہ انگریزی اور اردو ملا ہوا علی گڑھ کالج سے نکلنا شروع ہوا، اول اول وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کا ضمیمہ بن کر نکلتا رہا لیکن ۱۸۹۴ء میں اس نے ایک مستقل رسالہ کی صورت اختیار کی، اس کے مضامین زیادہ تر کالج کی خبروں اور اس کے متعلقات پر محدود ہوتے تھے اور اس وجہ سے عام پبلک کو اس کے ساتھ چنداں دلچسپی نہ تھی۔

اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو زیادہ وسعت دینی چاہی تا کہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے جس میں کالج کی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم وفنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پرزور مضامین لکھے جائیں، اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا، میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا۔'' (۲)

اس کالج میگزین کو علمی آب وتاب دینے کے لئے علامہ شبلی نے سب سے پہلے اردو کے نامور اہل قلم، مصنفین اور انشاپردازوں سے اس میں مضامین لکھنے کی فرمائش کی، چنانچہ مولانا حالی (ف ۱۹۱۴ء)، نواب محسن الملک (ف ۱۹۰۷ء)، ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء) اور منشی ذکاء اللہ وغیرہ نے مضامین لکھنے کا وعدہ کیا (۳) اور ان کے بعض مضامین شائع بھی ہوئے۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے یہ منصوبہ بھی بنایا کہ اس میں اسلامی سلطنتوں کے تمدنی اور انتظامی کارناموں پر علمی وتحقیقی مضامین قلم بند کئے جائیں اور پھر انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے (۴)، چنانچہ خود انھوں نے متعدد معرکہ آرا تحقیقی مضامین سپرد قلم کئے، علماء کے فرائض (جون ۱۸۹۵ء)، اسلامی حکومتیں اور شفاخانے (جولائی ۱۸۹۵ء)، حقوق الذمیین (اپریل، مئی ۱۸۹۶ء)، املا اور صحت الفاظ (مارچ ۱۸۹۸ء)، سرسید اور اردو لٹریچر (جون

۱۸۹۸ء) جیسے ان کے گراں قدر مقالات اسی رسالہ کی زینت بنے۔

اپنی تحریروں کے علاوہ سر سید، مولانا حالی، منشی ذکاء اللہ، بہادر علی، شیخ عبداللہ، حاجی محمد اسماعیل، حامد علی صدیقی اور پروفیسر ضیاء الدین کے علمی، ادبی، تاریخی اور تعلیمی مضامین کے ذریعہ شبلی نے اس میں علمی شان پیدا کرنے کی کوشش کی، جو اس دور میں یقیناً ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

کالج میگزین کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات متنوع تھے، ادب، تاریخ، تہذیب، تعلیم، سوانح کے علاوہ کالج کی سرگرمیوں اور اس کی تنظیموں کی روداد وغیرہ بھی اس میں شائع ہوئیں، بعض انگریزی مضامین کے ترجمے بھی شائع ہوئے، پروفیسر آرنلڈ کے مضمون ''جاپان'' کا ترجمہ اسی میگزین میں شائع ہوا۔(۵)

قدیم اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز بھی علامہ شبلی نے اسی میگزین میں پیش کی تھی (۶)، ان کا خیال تھا کہ یورپ میں قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو اور طبع واشاعت کے لئے متعدد انجمنیں قائم ہیں جو بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہیں حتی کہ خود مسلمانوں کی نادر الوجود کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شائع کر رہی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ یہ کام ہم خود انجام دیں اور دنیا کو بتائیں کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کا کس قدر گراں مایہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔(۷)

ندوۃ العلماء کے تیسرے سالانہ اجلاس کی روداد بھی علامہ شبلی کے قلم سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تحریک ندوہ سے انھیں کس قدر دلچسپی تھی، سر سید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد اگرچہ انھوں نے حیدرآباد کا رخ کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل ودماغ اب تحریک ندوہ سے وابستہ ہو چکا تھا، ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لئے میں نے کالج چھوڑا تھا گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہیں ہوا''۔(۸)

تحریک ندوہ میں خود ان کے بہ قول ان کی دلچسپی کی دو خاص چیزیں ''نصاب تعلیم'' اور ماہنامہ ''الندوہ'' تھیں (۹)، چنانچہ جب وہ پوری طرح یکسو ہو کر ندوہ آئے تو ان دونوں

امور کی طرف مکمل توجہ کی، انھیں الندوہ کا ایڈیٹر بنانے میں ارکان ندوہ نے لیت ولعل سے کام لیا(۱۰)، تاہم وہ ایڈیٹر بنائے گئے گو مشترکہ ہی سہی (۱۱) لیکن وقت نے ثابت کردیا کہ اگر وہ ایڈیٹر نہ ہوتے تو الندوہ-الندوہ نہ ہوتا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کی ادارت (۱۸۹۴ء) کے دس سال بعد شبلی نے الندوہ کی ادارت (۱۹۰۴ء) سنبھالی، ظاہر ہے اس کے تجربات یہاں کام آئے ہوں گے، دونوں رسالوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی علی گڑھ کے بالمقابل یہاں زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے افکار وخیالات کو پیش کرتے ہیں، غالباً اس کی بڑی وجہ تحریک ندوہ سے ان کی ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی ہے۔

ماہنامہ الندوہ کی اشاعت کے حسب ذیل مقاصد تھے:

[۱] علوم وفنون پر ریویو

[۲] علوم قدیمہ وجدیدہ کا موازنہ

[۳] اثبات عقائد اسلامیہ ازعقل

[۴] تحقیقات جدیدہ

[۵] کتب نادرہ قدیمہ پر ریویو

[۶] رپورٹ ماہوار ندوہ (۱۲)

ماہنامہ الندوہ کے دستور العمل میں بھی یہ مقاصد بیان کئے گئے ہیں (۱۳)، البتہ اس میں حسب ذیل اضافہ ہے:

[۱] اکابر سلف کی سوانح عمریاں جس میں زیادہ تر ان کے اجتہادات سے بحث ہوگی۔

[۲] نصاب تعلیم مروجہ پر بحث

[۳] علمی خبریں۔(۱۴)

الندوہ ان مقاصد کے ساتھ اگست ۱۹۰۴ء میں بڑی آب وتاب سے نکلا اور بہت جلد علمی دنیا میں ایک امتیازی درجہ حاصل کرلیا، شاید ہی کسی اور علمی رسالے کو اس قدر جلد ایسی

مقبولیت ملی ہو، وہ ہر حلقے موافق ومخالف میں پڑھا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، ڈپٹی نذیر احمد کے ان عربی اشعار سے اس کی شہرت ومقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

یقولون ان العلم والفضل والنھی　　حبیس علی المتقدم المتبصر

فلما یصفحنا صحائف ندوة　　وجدنا بان الفضل للمتاخر

ترجمہ: ''لوگ کہتے ہیں کہ فضل وکمال اگلوں کا حصہ تھا مگر جب میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ فضل وکمال پچھلوں ہی کا حصہ ہے''۔ (۱۵)

الندوہ کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

''الندوہ کا اثر خصوصیات کے ساتھ نوجوان علما اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بے حد پڑا اور نام نہیں لوں گا مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درس گاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایہ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرے میں ناموری حاصل کی اور ان سے دین وملت کو فائدہ پہنچا''۔ (۱۶)

علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کے ذریعہ متعدد کام انجام دئے، تحریک ندوہ کو بام عروج تک پہنچایا، نصاب تعلیم پر بحث کا آغاز ہوا، علوم قدیمہ پر نقد وجرح کا سلسلہ شروع کیا، ان کے علاوہ شبلی نے اپنے افکار ونظریات کی پیش کش بھی ماہنامہ الندوہ کے ذریعہ کی، اس سلسلے کا سب سے اہم کارنامہ تصنیف وتالیف کے لئے طلبائے ندوہ اور دیگر اہل قلم کی ذہنی ودماغی تربیت ہے، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ضیاء الحسن ندوی، خواجہ عبد الواحد اور عبد اللہ عمادی وغیرہ نے اسی رسالے سے ناموری حاصل کی اور نامور مصنف ہوئے۔

تصنیف وتالیف کے لئے علامہ شبلی نے یہیں مولانا سید سلیمان ندوی کی تربیت کی اور اس کے تمام گر سکھائے، الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا، شذرات لکھنے کا انھوں نے یہیں آغاز کیا، ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ کی ادارت اور اس کی خدمات کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے

تو یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکے گی کہ سب شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ ہی میں (اکتوبر ۱۹۰۵ء - مارچ ۱۹۰۶ء) شبلی کے زیر تربیت رہے، یہیں سے علمی دنیا میں وہ متعارف ہوئے، ارباب نظر جانتے ہیں کہ "الہلال" میں جو کچھ جلوہ گر ہوا، اصلاً اس کا تخم الندوہ ہی میں پڑا تھا، مولانا آزاد کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی بھی الہلال سے وابستہ رہے جن کی تربیت بھی شبلی نے الندوہ ہی میں کی تھی۔

صاحب اقبال کامل اور مصنف شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی نے الندوہ ہی سے قلم پکڑنا سیکھا، ۱۹۰۶ء میں ان کا پہلا مضمون "تناسخ" شائع ہوا، علامہ شبلی نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی، انعام سے نوازا اور ان کے بڑے مصنف ہونے کی پیشین گوئی کی۔ (۱۷)

تصنیف وتالیف کی تربیت اور ذہنی ودماغی نشوونما کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے بعد ہندوستان میں علم وفن کی جو بہار آئی اور اہل قلم اور ناموران علم و فن کی جو کہکشاں سجی وہ سب فیضان شبلی ہی کا پرتو ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کی از پرتو   ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

علامہ شبلی نے الندوہ کی ادارت کے زمانے میں احباب ومعاصرین اور خاص طور سے اپنے تلامذہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مدیر کی حیثیت سے ایک ایک پہلو پر نظر رکھتے تھے۔ موضوعات، مقاصد اور معیار کا انھیں بڑا خیال رہتا، ایک مرتبہ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے الندوہ کے لئے مضامین نہ لکھ سکے تو سب ایڈیٹر مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ "عزیزی چند روز تک میرے مضمون سے اب پرچہ بالکل خالی رہے گا، دیکھو ایسا نہ ہو کہ اپنی حیثیت سے گر جائے"۔ (۱۸)

مضامین کی ترتیب، کتابت وطباعت کا حسن، تصحیح وغیرہ کا وہ بڑا خیال رکھتے (۱۹) اور حسن ونفاست کے ساتھ اس کی اشاعت کے خواہش مند رہتے (۲۰)، وہ ایک ایڈیٹر کے لئے ضروری خیال کرتے تھے کہ مضامین بغیر دیکھے شائع نہ ہوں (۲۱) اور ایک دو ماہ کے مضامین

ہمیشہ موجود رہیں۔(۲۲)

ادب و انشااور تحریر کے معیار و مذاق کا بھی انھیں بڑا خیال رہتا، مولانا عبدالسلام ندوی نے رسالہ ''ادیب'' الہ آباد پر تبصرہ کیا اور لکھا کہ'' حال میں الہ آباد انڈین پریس سے ادیب ظاہری شکل وصورت میں اس آب ورنگ سے نکلا کہ تمام لوگ پکار اٹھے کہ

اس طرح کا جمال ہو ، ایسا شباب ہو(۲۳)

چوں کہ یہ تبصرہ شذرات میں لکھا گیا تھا اس لئے علامہ شبلی نے تنبیہ کی اور مولانا عبدالسلام ندوی کو لکھا کہ:۔

''رسالہ ادیب کی نسبت تم نے جو ریمارک لکھا ہے وہ ایڈیٹوریل میں لکھا ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ میرا لکھا ہوا ہے، مجھ کو اس سے نہایت افسوس ہوا، میرا وہ طرز عبارت نہیں اور جو مصرعہ تم نے نقل کیا ہے اس کو میں اپنے حق میں ازالہ حیثیت عرفی سمجھتا ہوں، آئندہ احتیاط رکھو کہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے درج نہ ہونے پائیں''۔(۲۴)

اس تنبیہ کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کی تردید کی (۲۵)،مگر بالآخر علامہ شبلی کا خدشہ درست نکلا، مولانا عبدالحلیم شرر نے ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے عنوان سے ان پر سخت تنقید کی۔(۲۶)

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا کہ'' دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا ہے البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے''۔(۲۷)

علمی رسالوں کے لئے علامہ شبلی علمی خبروں کو ضروری خیال کرتے تھے، ان کی کوشش ہوتی تھی کہ الندوہ میں پابندی سے علمی خبریں شائع کی جائیں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالسلام ندوی اپنی سب ایڈیٹری کے زمانہ میں اس کا اہتمام کرتے رہے، سید صاحب نے بھی اس کالم کو جاری رکھا، ایک مرتبہ کئی ماہ تک ناغہ ہوگیا تو علامہ شبلی نے تنبیہ کی اور لکھا کہ

''تم نے غلطی کی اور ہمیشہ یہ غلطی ہوتی ہے کہ الندوہ میں علمی خبریں نہیں دیتے، جس کی وجہ سے اب کی ۲۰-۲۵ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا''۔ (۲۸)

علامہ شبلی نے کسی تنقید کا جواب سوائے المامون (۲۹) کے نہیں لکھا، ان کے ایک مضمون ''اسلام اور مسئلہ ارتقا'' پر اعتراضات ہوئے (۳۰)، سید صاحب نے اس کا جواب لکھا (۳۱)، علامہ نے اس پر ناراضگی ظاہر کی اور لکھا کہ ''اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی اتنے ہیں کہ لوگ ہمارا جواب لکھیں (۳۲) مگر پھر انھوں نے اس کی وضاحت کی کہ:-

> ''گزشتہ پرچے میں جو مضمون مسئلہ ارتقا پر نکلا تھا اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے بلکہ صرف یہ دکھلانا تھا کہ مسئلہ ارتقا کا خیال ڈارون کا پیدا کیا ہوا کوئی نیا خیال نہیں ہے بلکہ اس سے مدتوں پہلے بعض حکمائے اسلام کی بھی یہی تحقیق تھی''۔ (۳۳)

وہ مدیروں کے لئے اہل علم سے ربط وضبط اور خط وکتابت کو بھی لازمی قرار دیتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی کو متعدد خطوط میں اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ (۳۴)

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی نے ایک مدیر کی حیثیت سے الندوہ کے ہر پہلو پر نظر رکھی بلکہ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد الندوہ کا وہ معیار قائم نہ رہ سکا اور بالآخر وہ بند ہو گیا۔

الندوہ نے دیرپا اثرات قائم کئے اس کے بعد علمی افق پر جو بھی رسائل آئے، انھوں نے کسی نہ کسی نوع سے اس کی تقلید کی، الندوہ کے جو نتائج نکلے مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں وہ یہ ہیں:-

[۱] اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کیا۔

[۲] جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔

[۳] علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔

[۴] عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔

[۵] اسلام اور تاریخ اسلام پر بہت سے اعتراضات کو رفع کیا۔

[۶] قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی ، اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی۔ (۳۵)

ان نتائج کے پس منظر میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج ملک میں علم و تحقیق کی جو فضا بالخصوص تحقیقی مقالہ نگاری کا جو سلسلہ چلا وہ سب بہ راہ راست یا بالواسطہ علامہ شبلی ہی کا فیضان ہے۔

۱۹۱۲ء میں سید میر جان نے لکھنؤ سے مسلم گزٹ جاری کیا جو دراصل علامہ شبلی ہی کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ تھا، اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے (۳۶)، ہندوستان میں مسلمانوں کا اب تک کوئی آزاد اخبار نہیں ہے جو ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکے، مولانا شبلی کی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اس زمانہ میں اس کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ انھوں نے اس کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اس کی ذمہ داری بھی قبول کی، مولوی وحید الدین سلیم کو علی گڑھ سے بلا کر ایڈیٹر بنایا، متعدد مضامین اور نوٹ لکھے، ان کوششوں کی وجہ سے بہت جلد مسلم گزٹ مقبولیت کے آسمان پر چمک اٹھا۔

علامہ شبلی نے اس زمانہ میں ملی مسائل پر جو مضامین لکھے وہ اسی اخبار میں شائع ہوئے، فتنہ ارتداد کی لہر اٹھی تو تمام برادران اسلام کی خدمت میں اس اخبار کے ذریعہ نومسلمانوں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کی اپیل کی، مجلس علم کلام کی تجویز بھی اسی اخبار کی زینت بنی اور ان کا شاہ کار سیاسی مقالہ مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ اسی اخبار کے صفحات پر شائع ہوا جس نے مسلمانوں کی سیاسی فکر میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

مسلم گزٹ کے گو ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم رہے تاہم عملاً اس کے مدیر علامہ شبلی ہی تھے، ان ہی کی تجاویز اور مشوروں سے یہ نکلتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ عام خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ علامہ شبلی ہی کا اخبار ہے۔ (۳۷)

اس اخبار کے ذریعہ علامہ شبلی نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ملی جذبہ برانگیختہ کرنا چاہا اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے، دراصل یہی وہ صور تھا جو بعد میں الہلال نے پھونکا۔

آخر عمر میں جب علامہ شبلی سیرۃ النبی کی تالیف و تدوین اور دارالمصنفین کی بنا و

تاسیس میں مصروف تھے، انھیں ایک علمی رسالہ ''معارف'' کے اجرا کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ انھوں نے اس کا خاکہ اور اس کے اغراض و مقاصد پر مشتمل ایک نوٹ لکھا جو ان کی ایک قلمی یادداشت میں اس طرح محفوظ ہے:

[۱] نام: معارف

[۲] چیف ایڈیٹر: شبلی

[۳] اسٹاف: مولوی سلیمان، مولوی عبدالماجد، مسٹر حفیظ، مولوی عبدالسلام

[۴] تعداد صفحات: تقطیع و کاغذ: ۲۰x۲۹، ضخامت ۴۰ صفحے، قیمت ۳/روپے

[۵] متنوعات مضامین: فلسفہ، تاریخ، قدیم و جدید سائنس

[۶] ادبیات: شعر، اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب

[۷] اقتباسات: مجلات علمیہ یورپ اور مصر و بیروت

[۸] فن تعلیم: کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات یا ان پر اظہار رائے

[۹] تنقید: کتب یا علوم قدیمہ پر (۳۸)

مگر ابھی معارف کا اجرا نہ ہو سکا تھا کہ ان کا وقت موعود آ پہنچا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی خواہش اور خیال کے مطابق جولائی ۱۹۱۶ء میں ماہنامہ ''معارف'' جاری کیا، علامہ شبلی نے مختصراً اس کے جو اغراض و مقاصد تحریر کئے تھے، سید صاحب نے تفصیل سے اس کی وضاحت کی اور ایک علمی رسالے کی ضرورت کا ذکر کیا۔ (۳۹)

۱۹۱۶ء سے آج تک معارف علامہ شبلی کے قائم کردہ نہج پر بلا ناغہ نوے برس سے شائع ہو رہا ہے، سیکڑوں موضوعات پر ہزاروں علمی و تحقیقی نگارشات شائع ہو چکی ہیں، برصغیر کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، آج اس کی حیثیت کسی معرکۃ الآرا انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں، اس کی اہمیت شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس قول سے واضح ہے کہ ''معارف ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے (۴۰)، عبدالمجید سالک کے بہ قول'' معارف بلا مبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے اور جس نے ہماری تاریخ و

تحقیق کے ذخیرہ کو مالامال کیا ہے"(۴۱) اور آخر میں عالم اسلام کے مایہ ناز محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے اسے ہماری تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ اور ماخذ قرار دے (۴۲) کر ثابت کر دیا کہ معارف کی قدر و منزلت کسی دور میں کم نہیں ہوئی، بلاشبہ یہ سب علامہ شبلی ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی، ج ا ص ۱۴۵۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

(۲) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، علی گڑھ، جنوری ۱۸۹۶ء ٹائٹل کا صفحہ ۲۔

(۳) ایضاً۔

(۴) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۱۶۲، دار المصنفین ایڈیشن، طبع چہارم

(۵) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، علی گڑھ، جنوری ۱۸۹۶ء ص ۲۵

(۶) ایضاً مئی ۱۸۹۶ء ص ۲۱۶

(۷) ایضاً۔

(۸) مکاتیب شبلی، ج ا ص ۱۴۳۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

(۹) ایضاً ص ۱۴۵۔

(۱۰) ایضاً ص ۱۴۳-۱۴۵۔

(۱۱) علامہ شبلی کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھی ایڈیٹر تھے۔

(۱۲) نقوش لاہور، مکاتیب نمبر، ص ۱۸۴، ادارۂ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء، مدیر محمد طفیل۔

(۱۳) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۴ء، آخری صفحہ ٹائٹل

(۱۴) ایضاً۔

(۱۵) حیات شبلی، ص ۸۱۰

(۱۶) ایضاً ص ۱۴۴۔

(۱۷) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۲۰۹ بنام مہدی افادی

(۱۸) ایضاً ج ۲، ص ۶۸، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء

(۱۹) ایضاً ج ۲، ص ۶۲ و ۶۴

(۲۰) نقوش لاہور، مکاتیب نمبر، ص ۱۸۵
(۲۱) ایضاً۔
(۲۲) مکاتیب شبلی، ج ۲ ص ۷۰۔
(۲۳) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، مارچ ۱۹۱۰ء ص ۶
(۲۴) مکاتیب شبلی، ج ۲ ص ۱۴۹
(۲۵) ماہنامہ الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء
(۲۶) دلگداز، جون ۱۹۱۰ء ص ۶-۸
(۲۷) مکاتیب شبلی، ج ۲ ص ۷۳
(۲۸) ایضاً س ۷۲
(۲۹) المامون پر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے سخت تنقید کی تھی جس کے جواب مین علامہ نے ایک مراسلہ لکھا تھا جو آزاد اخبار لکھنؤ کی ۲۲ رفروری ۱۸۸۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا
(۳۰) مکاتیب شبلی، ج ۲ ص ۶۷
(۳۱) ایضاً
(۳۲) ایضاً ص ۷۸
(۳۳) ماہنامہ الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۷ء ص ۱-۲
(۳۴) مکاتیب شبلی، ج ۲ ص ۵۶-۱۱۱
(۳۵) حیات شبلی، ص ۴۴۰
(۳۶) ایضاً، ص ۶۱۱
(۳۷) ایضاً، ص ۶۱۳
(۳۸) قلمی یادداشت، محفوظہ دار المصنفین، اعظم گڑھ
(۳۹) شذرات، ماہنامہ معارف، جولائی ۱۹۱۶ء
(۴۰) اقبال نامہ حصہ اول، مکتوب بنام سید سلیمان ندوی، ص ۸۰، مطبوعہ لاہور
(۴۱) ماہ نو- کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء ص ۲۵
(۴۲) ماہنامہ معارف، دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۱۷۴، مکتوب پیرس۔

☆☆☆

علامہ شبلی کے تاریخی مقالات

علامہ شبلی کی بلند پایہ مورخانہ حیثیت سے ارباب نظر بخوبی واقف ہیں وہ ابن خلدون کے بعد پہلے مسلمان مورخ ہیں جنھوں نے ایک نظریہ تاریخ پیش کیا اور نہ صرف نظریہ تاریخ پیش کیا بلکہ اپنی تصانیف میں خود ان پر عمل پیرا بھی رہے، ان کی تاریخی کتابیں المامون، الفاروق اور سیرۃ النبیؐ وغیرہ اس کا بہترین عملی نمونہ ہیں مہدی افادی نے اسی بنیاد پر انھیں ملک میں تاریخ کا معلم اول قرار دیا تھا۔ (۱)

علامہ شبلی کی علمی زندگی کا بیشتر حصہ اسی فن تاریخ کی خدمت میں گذرا جہاں انھوں نے متعدد تاریخی کتابیں قلم بند کیں وہیں درجنوں معرکہ آرا تاریخی مقالات بھی سپرد قلم کئے جو اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً کتب خانہ اسکندریہ، الجزیہ، تراجم، حقوق الذمیین اور اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ۔

مقالہ نگاری کی ابتداء سرسید مرحوم نے کی تھی علامہ شبلی نے اسے مزید ترقی دی، اور نئے بال و پر اور پرِ پرواز عطا کی، دراصل تاریخی مقالہ نگاری کا آغاز علامہ شبلی ہی سے ہوتا ہے بعد میں ان کے تتبع کی بڑی کوشش ارباب قلم نے کی مگر اس معیار تک نہ پہنچ سکے جو علامہ شبلی نے قائم کردیا تھا اس لئے ان کے مقالات انفرادیت کے ساتھ آج بھی لائق مطالعہ اور نفع بخش ہیں۔

علامہ شبلی کے تاریخی مقالات ان کی زندگی ہی میں رسائل شبلی کے نام سے شائع ہوگئے تھے، ان کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے ہر قسم کے مقالات کو ۸ جلدوں میں مرتب کیا اور انھیں مذہبی، علمی، تعلیمی، تاریخی اور فلسفیانہ وغیرہ عناوین کے تحت

تقسیم کیا، خاص تاریخی مقالات کو دو جلدوں (پنجم وششم) میں جمع کیا، یہاں انھیں اہم تاریخی مقالات کا تعارف وتجزیہ مقصود ہے۔

۱- حضرت اسماء وهند

ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں علامہ شبلی نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا مقصد ان کی اور تحریروں کی طرح یہی تھا کہ مسلمان یورپ اور ان کے اہل قلم کی بجائے اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہوں اور ان کی عظمت وسربلندی سے خود اپنی سربلندی کا سامان کریں، اس سلسلہ کا پہلا مضمون حضرت اسماء وہند کے نام سے ہے، اس میں تاریخ اسلام کی دو عظیم ماؤں حضرت اسماء والدہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور ہند والدہ حضرت امیر معاویہؓ کی شجاعت وبہادری، استقلال وثبات اور دلیری وآزادی سے متعلق واقعات نقل کر کے ان کی نہایت مؤثر اور لائق تقلید سیرت بیان کی گئی ہے۔

۲- المعتزله والاعتزال

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے مسلک اعتزال اور فرقہ معتزلہ کی اجمالی تاریخ قلم بند کی ہے جس میں اعتزال کی ابتداء وارتقاء، عروج، معتزلہ کے عقائد وخیالات اور علمائے معتزلہ کی خدمات اور کارہائے نمایاں کا ذکر کیا گیا ہے، اس مقالہ میں علامہ شبلی کے تاریخی اصول صاف ظاہر ہیں اور ان کے نظریہ تاریخ کے اہم عناصر صحت واقعہ، روایت ودرایت، قیاس واجتہاد علوم وفنون سے واقفیت اور صاحب تذکرہ کے دونوں رخوں کی تصویر واضح نظر آئی ہے، یہ مقالہ اگرچہ مکمل نہ ہو سکا تاہم اردو میں اپنے موضوع پر ایک منفرد تحریر ہے۔

تہذیب الاخلاق میں یہ مقالہ علامہ شبلی نے الاسدی الاعظمی کے فرضی نام سے شائع کیا تھا اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی پہلے شخص ہین جنھوں نے اعظمی کی نسبت اختیار کی۔

۳- ابن رشد

اس مقالہ میں بارہویں صدی عیسوی کے نامور فلسفی ابن رشد کی ولادت سے وفات

تک کے حالات بترتیب لکھے گئے، جس میں ابن رشد کی تعلیم وتربیت، اخلاق وعادات، فضل وکمال، عظمت وبلندی، تصنیفات، فلسفہ سے دلچسپی اور یورپ میں اس کی اشاعت ومخالفت وغیرہ کی تفصیلات مختصراً قلم بند کی گئی ہیں، یہ مقالہ گو مختصر ہے تاہم جامعیت میں وہ کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں۔

ابن تیمیہ

علامہ شبلی کو ناموران اسلام سے خاص دلچسپی کی وجہ دراصل یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو مغرب کی علمی ترقیوں اور سحر کاریوں کے رعب واثر سے دور رکھنا چاہتے تھے، انھوں نے امام ومجدد وقت علامہ ابن تیمیہ کے حالات وکارنامے اسی خواہش کے تحت قلم بند کئے۔

علامہ ابن تیمیہ کے نام ونسب، ولادت ووطن، تعلیم وتربیت، فضل وکمال، علوئے مرتبہ اوران کے کارناموں کے ساتھ ان کی پُرآشوب زندگی کے واقعات کو انھوں نے خاص اپنے رنگ تحقیق وتحریر کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی تجدیدی خدمات کا نہایت عمدہ مرقع نظر کے سامنے آجاتا ہے، اس مقالہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ علامہ ابن تیمیہ پر پہلا اردو میں مقالہ تھا جس کے ذریعہ اردوداں طبقہ پہلی بار امام ابن تیمیہ کی عظمت وبلند پایگی سے واقف ہوا۔

۵- موبدان مجوس ہندوستان میں

علامہ شبلی کا یہ مقالہ بھی مورخین یورپ کے جواب میں لکھا گیا ہے چونکہ ہندوستان کی تاریخ میں موبدان مجوس کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے اس لیے مغربی اہل قلم نے اس کا سبب مسلمان حکمرانوں کا تعصب بتایا، علامہ شبلی نے زیرنظر مقالہ میں پارسیوں کے ان مذہبی پیشواؤں کا مختصر حال لکھا ہے جو اسلامی دورحکومت میں عرصہ سے ہندوستان میں سکونت پذیر تھےاور جن کی علمی خدمات کو مسلمان اہل قلم نے بھی سراہا، ان موبدان مجوس کو ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں مذہبی آزادی مکمل طور پر حاصل تھی اور ملک کی دیگر قوموں اور باشندوں کی طرح ان کو کسی قسم کی نہ تکلیف پہنچائی گئی اوران کے ساتھ تعصب کا کوئی واقعہ بھی تاریخی شہادتوں میں مذکور نہیں۔

۶- زیب النساء

علامہ شبلی نے یہ مضمون انڈین میگزین اینڈ ریویو کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا تھا جس میں اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء کی نہایت بدنما تصویر پیش کی گئی تھی اور اس کی شخصیت پر متعدد رکیک اور ناروا الزامات لگائے تھے، علامہ شبلی نے اس کے جواب میں یہ مضمون لکھ کر زیب النساء کی اصل شخصیت سے لوگوں کو واقف کرایا اس میں اس کی ولادت، تعلیم وتربیت، اخلاق وعادات، فضل وکمال، شاعری اور اس کی علم پروری وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور اس پر لگائے گئے الزامات کا ضعف دکھا کر ان کو ناقابل لحاظ ثابت کیا ہے۔

زیب النساء نے شادی نہیں کی تھی اور یہی ایک بات ہے جس نے مغربی اہل قلم کو رکیک حملوں کا موقع فراہم کردیا، اسی بنا پر یہ الزام لگایا گیا کہ مغل بادشاہ اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے، حالانکہ خود اورنگ زیب نے اپنی دوسری لڑکیوں کی شادی کی تھی۔

زیب النساء پر ایک الزام یہ لگایا گیا تھا کہ عاقل خاں سے اس کا تعلق عشق ومحبت کا تھا اور وہ اس سے ملنے چوری چھپے محل میں آیا کرتا تھا، ایک مرتبہ عالمگیر کو محل میں اس کی موجودگی کا علم ہوگیا، چنانچہ وہ محل میں آیا اور پانی گرم کرنے کا حکم دیا، عاقل خاں ڈر سے حمام کی دیگ میں چھپ گیا تھا عالم گیر نے انجام بن کر اسی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا جس میں وہ چھپا ہوا تھا، اخفائے راز کے ڈر سے عاقل خاں نے جان دے دی لیکن اف نہ کیا۔

اس غلط واقعہ کی علامہ شبلی نے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ان تمام تذکروں میں جہاں عاقل خاں کے حالات مذکور ہیں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں۔

علامہ شبلی نے یہ مقالہ مستند مآخذ مثلاً مآثر الامرا، مآثر عالمگیری، عالمگیر نامہ، سرو آزاد، خزانہ عامرہ، ید بیضا، مخزن الغرائب وغیرہ کی روایت کی روشنی میں سپرد قلم کیا اور اس طرح ایک صریح بہتان اور اتہام کا نہایت علمی وتحقیقی رد کیا۔

زیب النساء پر اردو میں یہ پہلی تحریر تھی جس سے انگریزی مورخین کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک ہوا اور زیب النساء کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق وصلاحیت اور اچھے کردار سے بھی اردو

داں طبقہ پہلی بار واقف ہوا۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی

اس مختصر مضمون میں نامور مورخ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات وسوانح قلم بند کئے گئے ہیں اور ولادت سے وفات تک کے حالات، فضل وکمال اوران کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے، آزاد بلگرامی کثیر التصانیف مصنف ومورخ گذرے ہیں اگرچہ متعدد موضوعات پران کی کتابیں ہیں تاہم ان کا اصل میدان فن تاریخ تھا اور غالباً اسی حیثیت سے علامہ شبلی کو ان سے خاص مناسبت رہی۔

فن تاریخ میں آزاد بلگرامی کی تصانیف کو خاص مقام حاصل ہے، سرو آزاد، ید بیضا، مآثر الکرام، خزانہ عامرہ، روضۃ الاولیاء، سبحۃ المرجان وغیرہ آج تاریخ ہند پر داد تحقیق دینے والوں کے لئے ناگزیر مراجع کی حیثیت سے معروف ہیں۔ مولانا شبلی نے اس مختصر میں مضمون میں آزاد بلگرامی کی تصویر کشی اس عمدگی سے کی ہے کہ ان کی زندگی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

۸- فرید وجدی بک

مصر کے نامور محقق ومصنف فرید وجدی بک نے فلسفہ جدیدہ سے اسلام کی تطبیق کی کوشش کی تھی یہ خالص علامہ شبلی کے ذوق کی چیز تھی، اس لئے وہ بھی علامہ کے ممدوح ہوئے، یہ مضمون گو مختصر ہے لیکن وجدی کے کارناموں کا مرقع ہے، علامہ نے جب یہ مضمون لکھا تھا وجدی اس وقت نوجوان تھے اور ان سے بڑی توقعات تھیں غالباً اسی لئے علامہ نے تعریف کے ساتھ ان کی بعض کمیوں کی نشاندہی بھی یہ لکھ کر کی کہ "فرید وجدی کے کمالات کے اعتراف کے باوجود ہم کو کسی قدر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان کی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہیں اس لئے حدیث یا قرآن مجید کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ان کی کم مائیگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ (۲)

۹- تراجم

یہ طویل اور قیمتی مقالہ ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک پر علامہ شبلی نے لکھا تھا، اس میں انھوں نے مسلمانوں کی علم دوستی اور معارف پروری کی داستان بیان کی ہے

اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی کون سی زبانیں سیکھیں اور دنیا کی دوسری قوموں کے کون کون سے علوم وفنون کی کتابوں کے اپنی زبان میں ترجمے کئے اور اس میں کس قدر شغف وانہماک اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

اس مقالہ میں یورپ کے مورخین کے اس الزام کی تردید بھی کی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں غیر قوموں کے علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور ان کے آثار کو برباد کر دیا تھا بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسروں کے علمی خزانوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی، اس کے لئے دار الترجمے قائم کئے، فارسی، سنسکرت، یونانی، لاطینی زبان کے ماہر مترجمین کا انتظام کیا اور مختلف علوم وفنون مثلاً فلسفہ یونان، ہیئت، جبر ومقابلہ، حساب، علم الآلات، جغرافیہ، طب، جامیٹری وغیرہ مختلف علوم وفنون کی اکثر اہم کتابوں کا ترجمہ کرایا، انھوں نے مترجمین اور ان کی مترجمہ کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے اور ان علوم وفنون سے مسلمانوں کی گہری دلچسپی کے واقعات لکھ کر ثابت کیا ہے کہ:

> "عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا اور اگر مسلمانوں کا دنیا میں قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند، فارس کے تمام علمی ذخیرے آج برباد ہو چکے ہوتے۔" (۳)

یہ مضمون دراصل علامہ شبلی کی پہلی تصنیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا تتمہ ہے۔

۱۰- کتب خانہ اسکندریہ

اسلام اور مسلمانوں پر مورخین یورپ کے من گھڑت اور بے سروپا الزامات میں یہ الزام سب سے زیادہ بلند بانگ اور مشہور ہوا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے مصر واسکندریہ فتح کیا تو انھوں نے وہاں کے قدیم اور مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے قائم تھا اور صدیوں کا علمی خزانہ تھا جلا کر خاک کر دیا اور اس طرح دنیا کو ایک عظیم علمی میراث سے محروم کر دیا، اس کی آڑ میں دراصل یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام اور مسلمان علم کے دشمن ہیں اس مفروضہ کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ اسے تاریخ کے مسلمات میں شمار کیا جانے لگا۔

اس بے سروپا الزام کے جواب میں علامہ شبلی نے مورخانہ قلم اٹھا کر بدلائل ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ الزام سراسر غلط ہے کیوں کہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہی اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اس کی تباہی و بربادی میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا بھی شریک تھے، مسلمانوں نے جب مصر و اسکندریہ فتح کیا تو اس کتب خانہ کا وہاں نام ونشان تک باقی نہ تھا۔

علامہ شبلی کا یہ مقالہ اتنا جامع، مدلل اور محققانہ تھا کہ ساری علمی وتحقیقی دنیا میں ہلچل مچ گئی، اس بیش قیمت تحریر نے مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا کر دیا اور مورخین یورپ کو تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں پر واقعتاً یہ سراسر غلط الزام تھا اور اس افتراء کا موجد چھٹی صدی عیسوی کا مورخ ابوالفرج ملطی تھا اسی کو کہتے ہیں ۔

الزام ہم ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

علامہ شبلی نے اس غلط اور بے بنیاد الزام کی تردید میں تاریخ اور اصول تاریخ سے نہایت دیانتداری سے کام لیا اور اصل واقعہ کی چھان بین میں اپنے وضع کردہ اصولوں سے غیر جانبداری کے ساتھ کام لیا۔

یہ مقالہ بہت مقبول ہوا اور کتابی صورت میں متعدد بار شائع ہوا دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی میں ترجمہ کیا یہ مقالہ ۱۸۹۲ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا، مگر آج بھی اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۱- اسلامی کتب خانے

اس میں علامہ شبلی نے کتب خانوں کی اجمالی تاریخ لکھی ہے اور عہد اسلامی کے اکثر کتب خانوں کا تعارف، ان کا انتظام اور طریقہ کار لکھا ہے اور کتب خانوں کی اہم کتابوں کا ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں جس کثرت سے کتب خانے قائم تھے اس کی نظیر کہیں اور ملنی مشکل ہے، اس مقالہ میں علامہ شبلی نے خاص طور سے ثابت کیا کہ

مسلمانوں نے غیر قوموں کی یادگاروں کومحفوظ رکھنے اور ان کے حالات و واقعات لکھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا جو ان کی رواداری اور وسیع النظری کا ثبوت ہے۔

یہ مقالہ اگرچہ تاریخ کے ایک پہلو پر مشتمل ہے تاہم علامہ شبلی نے نہایت تحقیق وتدقیق اور مورخانہ تلاش وتفحص کے ساتھ اصول تاریخ کا بھرپور خیال رکھا ہے اور کہیں اپنے تاریخی نظریہ سے انحراف نہیں کیا ہے۔

یہ تاریخی مقالہ ۱۸۹۲ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور رسالہ حسن میں شائع ہوا تھا اور رسالہ کے دستور کے مطابق اس زمانہ میں علامہ شبلی کو اس پر ایک اشرفی انعام میں ملی تھی۔

۱۲ - اسلامی حکومتیں اور شفاخانے

اس میں عہد اسلامی کے شفاخانوں کی اجمالی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، علامہ شبلی جب علی گڑھ کالج میگزین کے ایڈیٹر بنائے گئے تو انھوں نے یہ اعلان کیا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے متعلق متعدد عنوانات کے تحت تحقیقی وتاریخی مضامین لکھے جائیں تاکہ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی تاریخ کی ایک جھلک مرتب شکل میں سامنے آجائے یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے (۴)۔ اس میں صرف پبلک ورکس کے ایک خاص پہلو شفاخانوں کے متعلق لکھا گیا ہے تاریخ میں بکھرے ہوئے اس مواد کو اکٹھا کر کے عہد اسلامی کے شفاخانوں کا مرقع تیار کیا گیا اور ثابت کیا گیا ہے کہ عہد اسلامی عوامی اور رفاہی کاموں اور انسانی ہمدردی کے کاموں میں کسی سے کبھی پیچھے نہیں رہا بعض شفاخانوں کے انتظام وانصرام سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے شفاخانوں سے وہ کسی طرح کم نہ تھے اور حکومت کے ذمہ دار، ان کی پوری دیکھ بھال کرتے تھے۔

علامہ شبلی کا یہ قیمتی مقالہ علی گڑھ میگزین میں جولائی ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا اور اپنے انفرادی موضوع کی وجہ سے بڑا مقبول ہوا۔

۱۳ - ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے ان تہذیبی وتمدنی ترقیوں کا ذکر کیا ہے جو مغل حکمرانوں کی کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں ہوئیں، مقالے کا آغاز عہد مغلیہ سے قبل ہندوستان کے

تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال سے کیا گیا ہے، اس کے بعد بابر سے عہد عالمگیر تک ہندوستانی تہذیب وتمدن میں جو تبدیلی اور ترقی ہوئی ان کی نشاندہی کی گئی ہے اور ضروریات زندگی مثلاً زمین کی پیداوار، زمینوں کی پیمائش، آراضی کا بندوبست، صنعت اور مصنوعات ترقی حیوانات اوران کی افزائش عمارات، شاہ راہ، رہن سہن، تعمیرات اور دیگر ایجادات واختراعات میں جو تبدیلی وترقی ہوئی اس کی تمام تفصیلات پیش کی گئی ہیں، اس کے لئے تزک بابری، تزک جہانگیری، آئین اکبری اور مآثر الامراء جیسے مستند ومعتبر ماخذ کو مرجع بنایا گیا ہے۔

۱۴- **مسلمانوں کی علمی بے تعصبی**

یہ مضمون کلکتہ کے مشہور اخبار بھارت متر کے ایڈیٹر کے ایک ناروا مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا، بھارت متر کے ایڈیٹر نے ملا مسیح کی رامائن پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں پر متعدد الزامات لگائے تھے مثلاً ملا مسیح کی رامائن گمنامی کے پردے میں اس لئے پڑی رہی کہ مسلمانوں نے اسے پسند نہیں کیا اور مسلمان ہمیشہ ہندوؤں کے لٹریچر سے بے خبر رہے جن لوگوں نے کچھ توجہ دی وہ تفریح کے طور پر دی مثلاً امیر خسرو وغیرہ یا پھر ان لوگوں کو کافر قرار دیدیا جاتا، اکبر کے عہد میں جو کچھ ہوا وہ بہت محدود تھا اور داراشکوہ کو ہندوؤں کے ادب سے دلچسپی کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا وغیرہ۔

یہ مضمون علامہ شبلی نے انھیں الزامات کی تردید میں لکھا ہے اور تاریخ کی معتبر کتابوں سے مسلمانوں کی علمی بے تعصبی علم پروری، ادب نوازی، رواداری، فراخدلی اور ہندوؤں کے زبان وادب سے دلچسپی کے سیکڑوں واقعات ثبوت میں پیش کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ علمی بے تعصبی میں دنیا کی کوئی اور قوم مسلمانوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملا مسیح اوران کی رامائن کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے ان کی رامائن کی عدم مقبولیت کی وجہ مسلمانوں کا تعصب نہیں بلکہ ملا مسیح کی کم درجہ کی شاعرانہ صلاحیت تھی، علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں یہ مثال بھی دی کہ فردوسی نے شاہنامہ میں

گبروں کے قصے لکھے اور صولت ترکستانی نے صولت فاروقی میں حضرت عمرؓ کی فتوحات نظم کیں مگر آج صولت ترکستانی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا اور فردوسی کا شاہنامہ بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔(۵)

۱۵- مکنکس اور مسلمان

اس مختصر مضمون میں علامہ شبلی نے مسلمانوں کی میکنکل ترقی کا ذکر کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ماضی میں مسلمان علمی و عملی ترقی اور ایجادات واختراعات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اس مضمون کا مقصد بھی غالباً مسلمانوں کے اندر حوصلہ وجذبہ پیدا کرنا تھا کہ ان کے اسلاف سائنسی علوم میں ایسے بلند مقام پر فائز تھے کہ یورپ نے بھی ان سے خوشہ چینی کی۔

ان مقالات کے علاوہ بھی چند اور تحریریں ہیں یہ گو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں لیکن ان کی اصل حیثیت تاریخی ہی ہے اس لئے یہاں ان کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۶- الجزیة (۶)

مغربی مورخین نے اسلام، بانیٔ اسلام، تہذیب وتمدن، شریعت اور تاریخ اسلامی پر جو الزامات عائد کئے ہیں ان میں سب سے اہم جزیہ سے متعلق الزام ہے، جزیہ ایک خراج ہے جو اسلامی حکومت وسلطنت میں غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت کے عوض میں لیا جاتا ہے، یورپ کے مورخین نے جزیہ کے ذریعہ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ اسلام کی بھی تصویر بگاڑنے کی کوشش کی، جزیہ کو ایک ظالمانہ اور توہین آمیز ٹکس قرار دیا اور تشہیر کی کہ جزیہ کا موجد اسلام ہے اور مسلمان حکمراں اسے اپنی رعایا سے جبراً وصول کرتے ہیں اور یہ غیر قوموں کو مسلمان بنانے کا ایک قوی حربہ ہے۔

مورخین یورپ نے ہندوستان کی مسلم تاریخ میں خاص طور سے اس موضوع پر اس لئے توجہ دی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کیا جاسکے، علامہ شبلی نے ان بے سروپا الزامات کے رد وابطال میں یہ قیمتی مقالہ ۱۸۸۹ء میں سپرد قلم کیا اور ان اعتراضات کی پرزور تردید کی، اس مقالہ میں علامہ شبلی نے تین باتوں کا جائزہ اس طرح لیا ہے کہ ان کے ضمن میں سارے الزامات کی تردید ہو جاتی ہے۔

[۱] جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے؟ [۲] ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب قائم ہوئی؟ [۳] اسلام نے اس کو کس مقصد سے اختیار کیا۔

چنانچہ علامہ شبلی نے ان سوالات کا مورخانہ اور تحقیقی جائزہ لینے کے بعد ثابت کیا ہے کہ جزیہ فارسی لفظ گزیہ کا معرب ہے۔ جس کے معنی خراج کے ہیں اور اس کا موجد اسلام نہیں بلکہ اسلام سے پہلے نوشیرواں تھا، اس نے یہ خراج اس لیے مقرر کیا تھا کہ فوجی اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر ملک اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں یہ خراج ان کی محنتوں کا معاوضہ ہوگا۔

مسلمانوں نے جب غیر مسلموں کے علاقے فتح کئے تو انھوں نے نوشیرواں کے اس خراج کو معمولی تبدیلی کے ساتھ باقی رکھا کیوں کہ اسلامی حکومت میں ہر مسلمان فوجی خدمت کے لئے مجبور کیا جاتا ہے لیکن غیر مسلم اس کے لئے مجبور نہیں کئے جاسکتے چوں کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت پر عاید ہوتی ہے اس لئے ان سے ان کی حفاظت کا معاوضہ جزیہ کے نام سے لیا جاتا ہے گویا یہ ان کے تحفظ و بقا کا معاوضہ ہے۔

علامہ شبلی نے تاریخی حوالوں سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اگر کبھی غیر مسلم رعایا نے فوجی خدمت انجام دی تو ان سے جزیہ نہیں لیا گیا یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم نے کسی سال فوجی خدمت میں حصہ لیا تو اس سال کا جزیہ معاف کر دیا گیا۔

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے جزیہ کی مقدار پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جزیہ کی رقم زیادہ سے زیادہ بیس روپے سالانہ تھی کسی کے پاس لاکھوں روپئے ہوں تو بھی اس سے زیادہ نہیں دینا پڑتا تھا جزیہ کی عام شرح چھ روپئے اور تین روپئے سالانہ تھی، ۲۰ ربرس سے کم اور پچاس سے زیادہ عمر والوں کو جزیہ معاف تھا اسی طرح عورت، مفلوج، معطل العضو، نابینا اور مجنون پر کوئی خراج نہیں تھا، مفلسوں یعنی جس کے پاس سو درہم سے کم ہوں ان سے عموماً جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ (۷)

غرض علامہ شبلی نے اپنی اس نادر اور انتہائی بیش قیمت تحقیق سے یورپ کے مورخین کے الزامات کی قلعی کھول دی یہ مضمون بہت مقبول ہوا سر سید احمد خاں نے انگریزی میں اس کا

ترجمہ کرایا خود علامہ شبلی نے اسے عربی کا جامہ پہنایا، مصر کے مشہور اخبار و رسائل نے اس کے خلاصے اور اقتباسات شائع کئے۔

۱۷- حقوق الذمیین (۸)

یورپ کے مورخین کے الزامات کی فہرست میں یہ فرد جرم بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ ہر طرح کے ظلم وزیادتی کو روا رکھا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ چونکہ اسلام میں غیر مسلموں کے لئے کوئی اصول وضابطہ اور قانون نہیں ہے اس لئے یہ مظالم روا رکھے گئے، علامہ شبلی کے زمانہ میں اس اعتراض کی لو اور تیز ہوگئی تھی اور بار بار اس طرح کے الزامات کا اعادہ کیا جارہا تھا، اسی زمانہ میں لنڈن ٹائمز (۲رجنوری ۱۸۹۵ء) میں پادری ملکم مال نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا جس میں بڑے طمطراق سے یہ ظاہر کیا کہ اسلام میں عیسائیوں کے لئے نہایت ظالمانہ قوانین ہیں اور مسلمان حکمراں ہمیشہ اس پر عمل کرتے رہے، دلی کی عیسائی مشنری نے اس مضمون کا ترجمہ چھاپ کر شائع کیا اور اس کے دیباچہ میں لکھا کہ یہ مضمون اس قدر مدلل ہے کہ ٹائمز کا مسلمان مضمون نگار بھی اس کا جواب نہ دے سکا۔ (۹) علامہ شبلی کا خیال تھا کہ ذمیوں کے حقوق کا مسئلہ ایسا مہتم بالشان اور وسیع ہے کہ اگر اس کا قطعی فیصلہ کردیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیوں کا سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ (۱۰) چنانچہ انھوں نے اسی طلسم کو توڑنے کے لئے یہ مدلل مضمون سپرد قلم کیا اور ان اعتراضات کی پرزور تردید کی اور نہایت مدلل انداز میں ثابت کیا کہ جزیہ کے ذریعہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بیشمار حقوق واختیارات عطا کئے تھے، مثلاً اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی مدافعت کی جائے گی ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا، ان کی جان ومال زمین اور عزت وآبرو محفوظ رہے گی، ان کے قافلے اور کاروان تجارت بھی محفوظ رہیں گے، ان کی تمام چیزیں انھیں کے قبضے میں رہیں گی، پادری، راہب اور گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں پر باقی رہیں گے اور انھیں برطرف نہیں کیا جائے گا، صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، ان سے عشر لیا جائے گا نہ ان کے ملکوں میں فوج بھیجی جائے گی ان کا مذہب اور عقیدہ بھی نہ بدلوایا

جائے گا، یہ حقوق ان لوگوں کو بھی حاصل ہوں گے جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ (۱۱)

علامہ شبلی نے اس مقالہ میں بتایا کہ مذکورہ بالا حقوق ذمیوں کو کم وبیش ہر دور میں حاصل رہے، خلفائے راشدین سے لے کر عہد شاہجہاں تک کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ذمیوں کو جو حقوق ملے ان کی مختصر تفصیل بھی علامہ شبلی نے اس میں پیش کی ہے اور بہت سے تاریخی واقعات سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ذمیوں کا اپنے دور حکومت میں پورا پورا خیال رکھا، انھیں بڑے بڑے مناصب عطا کئے اور انھیں مذہب وعقیدہ کی بنیاد پر کبھی شرمسار نہیں ہونا پڑا۔

علامہ شبلی کا یہ گراں مایہ مقالہ علی گڑھ میگزین مارچ اپریل ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا اور بڑے شوق سے پڑھا گیا اور بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

۱۸۔ تجارب الامم ابن مسکویہ (۱۲)

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے مشہور مورخ وفلسفی علامہ ابن مسکویہ کی نایاب کتاب تجارب الامم کا مختصر تعارف پیش کیا ہے اور ابن مسکویہ کے نظریات تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن تاریخ کو یورپ نے جس مقام پر انیسویں صدی عیسوی میں پہنچایا مسلمانوں نے اسے پانچویں صدی ہجری سے قبل ہی اسے اس معیار تک پہنچادیا تھا مگر اس دور میں تاریخ سے بے اعتنائی شروع ہوگئی تھی، جس کا ذکر ابن مسکویہ نے تجارب الامم میں کیا ہے، علامہ شبلی نے ابن مسکویہ کے اصول تاریخ کی تعریف کے ساتھ اس کے بعض اصولوں پر تنقید بھی کی ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا مقصد ابن مسکویہ کے نظریہ تاریخ اور اس کی نایاب کتاب سے اہل علم کو متعارف کرانا معلوم ہوتا ہے۔

۱۹ ہمایوں نامہ (۱۳)

اس مضمون میں ہمایوں نامہ کا تعارف کرایا گیا ہے جو گلبدن بیگم کی تصنیف ہے، گلبدن بیگم شہنشاہ بابر کی بیٹی ہمایوں کی بہن اور اکبر کی پھوپھی تھی یہ کتاب اکبر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، اس میں عہد ہمایوں کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی انگریز مصنفہ مس بیورج نے کئی سال کی تلاش وتفحص

اور محنت وتحقیق سے مرتب کر کے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا، علامہ شبلی نے ہمایوں نامہ کے اس نسخہ کا تعارف کرایا ہے اور اس کے لئے مصنفہ کی تعریف کی ہے۔

ہمایوں نامہ کے مشمولات کے حوالہ سے علامہ شبلی نے گلبدن بیگم کی مورخانہ صلاحیت اور سلیقہ تحریر وتصنیف کی بڑی تعریف کی ہے اور دکھایا ہے کہ گلبدن بیگم تاریخ نویسی کے اصول وآداب سے بخوبی واقف تھی، چنانچہ اس نے جہاں سیاسی واقعات لکھے ہیں، وہیں عہد ہمایوں کی تہذیبی وتمدنی تاریخ بھی لکھی ہے، اس کی تحریر مورخانہ انشاپردازی اور سادہ واقعہ نگاری کا نمونہ ہے، واقعات لکھنے میں پوری دیانتداری سے کام لیا ہے اور جو واقعات دوسروں سے سنے ہوئے لکھے ہیں ان کا حوالہ بھی دیا ہے جس سے اس کی مورخانہ ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہمایوں نامہ کے تعارف کا مقصد بھی تاریخ ہند کے اہم ماخذ ومراجع کی نشاندہی اور تاریخ کے ذوق کو عام کرنا معلوم ہوتا ہے۔

۲۰۔ مآثر رحیمی (۱۴)

اس مقالہ میں مآثر رحیمی جیسی معرکہ ارا کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے، یہ کتاب دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے، شروع کے ہزار صفحات میں عہد اکبر کے علماء وفضلاء وشعراء اور اہل علم کے حالات وواقعات ہیں آخری ہزار صفحات میں اکبر کے سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں کی زندگی کے حالات وسوانح قلم بند کئے گئے ہیں جس میں اس کی پیدائش، وطن، تعلیم وتربیت، اخلاق وعادات، فضل وکمال، شاعری وانشاپردازی کے علاوہ اس کے علمی ذوق، کتب خانہ، اہل علم کی قدردانی، علم پروری، ادب نوازی وغیرہ کی تفصیلات ہیں، اس مبسوط کتاب میں خان خاناں کے رفاہی وعوامی کاموں کا ذکر بھی ہے، صنعت وزراعت، تعمیرات مثلاً باغ حمام اور سرائیں تعمیر کرانے کا ذکر ہے، نیز ایجادات واختراعات مثلاً جہازوں کی تیاری اور ابری وعکسی کاغذ کے بنانے کا ذکر بھی ہے۔

یہ کتاب اکبری عہد کی تاریخ کا ایک معتبر مآخذ تصور کی جاتی ہے، اس کے مصنف کا نام عبدالباقی ہے وہ ایران کا باشندہ اور ایک معزز خاندان کا فرد تھا۔

مآثر رحیمی پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:- اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خان خاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں نکتہ چینی کا نام نہیں، مگر پھر اس کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ ''یہ اس دور کا عام مذاق تھا۔'' (۱۵)

۲۱۔ جہانگیر اور تزک جہانگیری (۱۶)

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے جہانگیر پر مورخین یورپ اور ان کے مقلدوں کے عائد کردہ الزامات کا جائزہ تزک جہانگیری کے حوالہ سے لیا ہے، تزک جہانگیری جہانگیر کا روزنامچہ ہے اور اسی کے قلم سے ہے شروع میں اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، علامہ شبلی کا خیال ہے کہ تزک جہانگیری میں جہانگیر نے اپنے تمام صحیح اور سچے واقعات لکھے ہیں، تصنع، بناوٹ اور ملمع سازی سے احتراز کیا ہے، خوبیاں اور خامیاں دونوں کو ڈنکے کی چوٹ پر لکھا ہے اور کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی ہے اور ہر واقعہ کو انتہائی سادگی صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا ہے، جہانگیر کے حالات و واقعات بلکہ اس کے ہر قسم کے خیالات کو معلوم کرنے کا سب سے معتبر ماخذ یہی کتاب ہے، علامہ شبلی نے تزک جہانگیری سے جہانگیر کے حالات و واقعات مثلاً سلطنت کے کاموں سے دلچسپی عدل وانصاف، رعایا کی دادرسی اور اس کی توجہ وخبرگیری حکومت کی پالیسی، ہندوؤں سے تعلقات اور ان کے ساتھ حسن سلوک، علماء وفضلاء اور اہل علم کی بلا امتیاز مذہب وعقیدہ قدردانی وغیرہ کی تفصیلات پیش کی ہیں، ساتھ ہی اس کی علم دوستی، معارف پروری اور اس کی ذاتی دلچسپی مثلاً علم الحیوان سے خصوصی شغف، مصوری سے لگاؤ، جغرافیائی تحقیق، صنائع وصنعت گری، مذاق سپہ گری اور شجاعت وبہادری وغیرہ کے واقعات کو بترتیب لکھا ہے اور پھر مورخین یورپ اور ان کے مقلدین کو باور کرایا ہے کہ جہانگیر بڑی خوبیوں کا مالک اور اسلاف کا نمونہ تھا اور اس پر جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں وہ بالکل لغو، بے سروپا اور کذب وافتراء کا نمونہ ہیں۔

مقالات شبلی کی چند خصوصیات

اوپر جن مقالات کا تعارف کرایا گیا ہے یہاں ان کی چند خصوصیات کا مجملاً ایک بار پھر ذکر کیا جاتا ہے۔

[۱] ان مقالات میں عموماً کسی تاریخی غلط فہمی یا بددیانتی یا اسلام اور مسلمانوں پر عائد کردہ مغربی مورخین اور اہل قلم اور ان کے مقلدین کا رد وابطال کیا گیا ہے انداز معروضی اور تحقیق وتنقید میں جدید اصول وآداب کا استعمال کیا گیا ہے۔

[۲] ان مقالات میں معروف ومسلم تاریخی اصول ونظریات مثلاً صحت مآخذ، روایت ودرایت، قیاس واجتہاد، زمانہ کا مذاق وماحول، سند اور حوالہ اور تحقیق وتنقید کی کارفرمائی واضح نظر آتی ہے۔

[۳] ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان سے فن تاریخ کی اہمیت وافادیت اُجاگر ہوتی ہے اور تاریخی ذوق عام کرنے اور ان کی طرف اہل علم کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش نمایاں ہے۔

[۴] ان مقالات کا ایک مقصد مغربی افکار کی یورش ویلغار سے پیدا ہوئی، مسلمانوں میں احساس کمتری دور کرکے ان میں احساس برتری اور نیک جذبہ پیدا کرنا ہے۔

[۵] ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مغربی اقدار وروایات کے مقابلہ میں صالح اور صحیح اسلامی اقدار وتہذیب پیش کی گئی ہے تاکہ مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہوں اور مغرب سے مرعوبیت کا دور دورہ ختم ہو۔

[۶] مسلمانوں کے متعلق یورپ کے غلط خیالات کی اصلاح اور ان کے معاندانہ طرز عمل کا بخوبی رد وابطال ہوجاتا ہے۔

[۷] ان مقالات سے مسلمانوں کی تہذیبی وتمدنی تاریخ کے بہت سے روشن پہلو سامنے آجاتے ہیں۔

[۸] ان سے علامہ شبلی کی وسعت معلومات اور تحقیق وتدقیق میں جانفشانی اور ان کی مورخانہ فہم وبصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

[۹] بعض مقالات اپنے موضوع پر تنہا اور منفرد ہیں جن کو اب تک کسی نے اپنا موضوع تحقیق نہیں بنایا اور نہ ان میں کوئی اب تک اضافہ ہوسکا۔

[۱۰] بعض مقالات نے مورخین کو نئے سرے سے غور وفکر اور تحقیق وتنقید کا ذوق پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور علم تاریخ کو نئے جہات سے روشناس کرایا جو علامہ شبلی کا

بڑا اہم کارنامہ ہے۔☆

حوالے

(۱) افادات مہدی ص ۱۹۲

(۲) مقالات شبلی ج ۵ ص ۱۳۱

(۳) ایضاً ج ۶ ص ۱

(۴) ایضاً ج ۶ ص ۱۷۷

(۵) ایضاً ج ۶ ص ۲۳۳

(۶) ایضاً ج ۱ ص ۲۲۱-۲۳۱

(۷) ایضاً ج ۱ ص ۲۳۱

(۸) ایضاً ج ۱ ص ۱۸۵-۲۲۰

(۹) ایضاً ج ۱ ص ۱۸۶

(۱۰) ایضاً

(۱۱) ایضاً

(۱۲) ایضاً ج ۴ ص ۱۹-۲۸

(۱۳) ایضاً ج ۴ ص ۵۴-۶۵

(۱۴) ایضاً ج ۴ ص ۶۶-۸۱

(۱۵) ایضاً ج ۴ ص ۸۱

(۱۶) ایضاً ج ۴ ص ۸۲-۱۱۴

☆☆☆

شبلی کی اردو شاعری

علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت جن اوصاف وکمالات سے عبارت ہے اس میں ان کی اردو شاعری بھی شامل ہے گو وہ ان کے دوسرے عظیم الشان علمی و تحقیقی اور ادبی کارناموں کی خیرہ کن چمک دمک میں دبی سی نظر آتی ہے اور خود علامہ شبلی اپنی شاعری کو تفریح طبع سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے تاہم واقعہ یہ ہے کہ ان کی اردو شاعری کے ذکر کے بغیر ان کی شخصیت کا ایوان سجانا بھی مشکل ہے۔

انھوں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں داد سخن دی، خاص طور سے ان کا فارسی کلام اساتذہ کے کلام سے کم رتبہ نہیں، لیکن مرزا غالب کی طرح انھیں بھی عزت وعظمت اور بقائے دوام کی دولت ان کے اردو کلام سے ملی۔

شبلی کو شعر وادب کا ذوق بچپن ہی سے تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا ذوق شعری فطری اور خدا داد تھا تو غلط نہ ہوگا، دورِ طالب علمی ہی میں کتب فروشوں کے یہاں بیٹھ کر شعرا کے دواوین کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا، جن کے اشعار بھی یاد ہو جاتے، شعر گوئی کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا، بچپن میں چادر کی ضرورت تھی تو اپنے والد کو یہ شعر لکھ کر پیش کیا۔

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

والد نے خوش ہو کر چادر انعام دی۔

دورِ طالب علمی میں فی البدیہہ مصرع موزوں کرنا اور اساتذہ کے کلام پر مصرع لگانا ان کے اسی ادبی ذوق کا پتہ دیتا ہے، مولانا فاروق چریا کوٹی کے یہاں جب وہ تحصیل علم میں مصروف تھے، اسی زمانہ میں ایک دن ننگے سر بیٹھے تھے کہ پیچھے سے آ کر مولانا چریا کوٹی نے سر پر

ایک ہلکی سی چپت لگائی اور خوش طبعی سے فرمایا۔

ہے گا چپت گاہ خلائق یہ سر

شبلی نے فی البدیہہ یہ مصرعہ موزوں کیا ۔

جتنے ہیں سران پہ ہے فائق یہ سر

شبلی کو ابتداء ہی سے شعروسخن کا ماحول ملا، اعظم گڑھ میں خود انھوں نے ایک ادبی فضا قائم کی اور ایسی مجلسوں کا انعقاد کیا جس میں غزلیں پڑھی جاتیں اور شعروسخن کی داد دی جاتی، شعر وادب کے اداشناس اور قادرالکلام شاعر مولانا فاروق چریا کوٹی کی صحبت نے شبلی کے ذوق ادب کو مزید جلا بخشی، چشمہ رحمت غازی پور گئے تو وہاں شمشاد لکھنوی سے قربت رہی، اسی طرح علی گڑھ، حیدرآباد اور لکھنؤ کے ادبی ماحول، شعروسخن کے چرچے شعراء کی صحبت اور ان کے ذاتی مطالعہ ومشاہدہ نے ان کے ذوق شعری کو نکھارا لیکن چونکہ شبلی نے شعروشاعری کو تفریح طبع سے زیادہ کبھی اہمیت نہیں دی اور نہ اس کو مشغلہ بنایا، اس لئے ان کا شعری سرمایہ محدود مختصر ہے۔

ان کے اردو کلام کے کئی ناقص مجموعے شائع ہوئے ان میں کلیات شبلی، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہے، لیکن اس میں بھی ان کے ابتدائی دور کی غزلیں شامل نہیں ہیں چوں کہ علامہ شبلی نے اپنے ابتدائی کلام کو زمانہ جاہلیت کی یادگار بتا کر رد کردیا تھا، غالباً اسی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے کلیات میں شامل نہیں کیا، لیکن ان کی مثنوی ''صبح امید'' اس میں شامل ہے، حالانکہ اسے بھی شبلی نے اپنی تصنیفات سے خارج کردیا تھا، اس لئے اب بھی ان کے ایک مکمل کلیات کی ترتیب وتدوین نو کا کام باقی ہے۔

کلیات شبلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے متعدد اصناف شاعری میں دادسخن دی، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، مسدس، غزل، رباعی اور قطعہ وغیرہ اصناف میں انھوں نے جو سرمایہ یادگار چھوڑا ہے یا جو دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے وہ اپنی عظمت اور فکروفن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے بالخصوص ان کی مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی نظمیں اردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں، ذیل مین ان کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مثنوی: علامہ شبلی کی مثنوی ''صبح امید'' جوان کے قیام علی گڑھ کی یادگار ہے، اصلاً سرسید تحریک کے پس منظر میں لکھی گئی ہے، ۳۵۴/اشعار پر مشتمل یہ مثنوی پنڈت دیاشنکرنسیم کی مثنوی گلزارنسیم کی بحر میں ہے اوراس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں پہلی بار حسن وعشق کے فرسودہ اورفرضی واقعات سے احتراز کر کے قومی عروج وزوال کی داستان قلم بند کی گئی ہے، اس کی ابتداء ان اشعار سے ہوئی ہے:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہان کی — جو تاج تھی فرق آسمان کی
تھے جس پہ نثار فتح واقبال — کسری کو جو کرچکی تھی پامال
گل کردیئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے

قومی عروج اور مسلمانوں کی فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد مسلمانوں کے علمی کارناموں اوران کی شان وشوکت وعظمت کا ذکر ہے، مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں کی پستی وزبوں حالی کے بیان کے بعداپنے عصروعہد کے شعراء کی روش، پست خیالی، علم وفن میں تنزل اوراخلاقی وسماجی کمزوریوں کا ذکر بھی تفصیل سے ہے، اس کے بعدتحریک علی گڑھ کا ذکر ہے۔

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر — پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں

سرسید کی انقلاب آفریں شخصیت کی مرقع آرائی ملاحظہ ہو۔

صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسم

سرسید کی اس تصویر کے بعدان کی تقریروں کی اثرانگیزی اورعمل کی طرف مائل کرنے کے انداز کا ذکر ہے اورقوم کے امراض اورمریض غم کی چارہ گری کا بڑے پردرد لہجے میں بیان

ہے، سرسید اوران کے رفقاء کے افکار وخیالات کی عکاسی بھی کی گئی ہے، اس عہد کے مدرسوں کی پستی، سرسید کے تعلیمی افکار، مدرسۃ العلوم، سرسید کی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹیں اور کامیابی وغیرہ کی تفصیل لکھی ہے، اس مثنوی کا خاتمہ ان ولولہ انگیز اشعار پر ہوا ہے:

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی　　اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے　　دن ڈھل بھی گیا تپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی　　اب تک ہے گہر میں آب باقی
گوخوار ہیں طرز و خو وہی ہے　　مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

یہ مثنوی فکروفن کا نمونہ ہے اس میں وہی ایجاز واختصار اور بلاغت ہے جس کے لئے مثنوی گلزار نسیم شہرت رکھتی ہے، علامہ شبلی نے متعدد جگہوں پر استعاروں سے کام لے کر دریا کو کوزے میں بند کیا ہے، فصیح الفاظ، معنی بلند، دل پذیر ترکیبیں، نازک استعارے اور تشبیہات، سلاست وروانی وغیرہ مثنوی کی جو خصوصیات ہیں وہ سب اس میں جلوہ گر ہیں اور اس لحاظ سے یہ مثنوی قدیم مثنویوں سے یکسر ممتاز ہے کہ اس میں حسن وعشق کے فرسودہ واقعات کی بجائے قوم وملت کے عروج وزوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔

مرثیہ: کلیات شبلی میں مثنوی 'صبح امید' کی طرح ایک مرثیہ بھی شامل ہے جو علامہ شبلی نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق ایڈوکیٹ ہائی کورٹ الہ آباد کی وفات پر لکھا تھا اور یہی ایک مرثیہ ان کی مرثیہ گوئی پر مکمل دسترس کا پتہ دیتا ہے، ایسا پراثر اور دردانگیز مرثیہ ہے کہ اس کو پڑھ کر مشہور عربی شاعرہ خنساء کے مرثیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا　　وہ کہ مجموعہ ہرخوبی انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمت یزدانی تھا　　قوت دست ودل شبلی نعمانی تھا

جوش اسی کا تھا جو میرے سر پر شور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامہ پرزور میں تھا

یہ بھی اے جان برادر کوئی جانے کا ہے طور　　اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور

ابھی آنے بھی نہ آیا تھا ترے اوج کا دور　　　کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر وسکوں جاتا ہے

کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

پورا مرثیہ درد واثر کی تصویر ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، فنی لحاظ سے بھی یہ مثالی مرثیہ ہے۔

قصیدہ: دورِ آخر میں جن لوگوں نے قصیدہ کو ترقی دی ان میں علامہ شبلی کا نام سرِ فہرست ہے انھوں نے متعدد قصیدے لکھے، بعض مواقع پر انھوں نے اپنے مخصوص ترنم میں پیش بھی کئے جن کی عرصے تک دھوم رہی، انھوں نے اس صنف سخن کو نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کیا، اچھوتی تشبیہات اور استعارات نے اس میں خاص روح اور نغمگی پیدا کر دی ہے، جسٹس سید محمود کی شادی پر انھوں نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ ان کا بہترین قصیدہ ہے اس باغ و بہار قصیدہ کا انداز وہی ہے جو محسن کاکوری کے قصیدے:

سمت کاشی سے چلا جانب بطحا بادل

کا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

سمت قبلہ سے جو اٹھی ہیں گھٹائیں ہر بار　　　کہتی ہیں توبہ زاہد سے کہ اب کے تو سنبھل

اوج اقبال تو دیکھو کہ سلیماں کی طرح　　　سیر کرتے ہوئے پھرتے ہیں ہوا پر بادل

اس کے بعد سید محمود کی مدح وستائش ہے، مقطع میں فرماتے ہیں:

میں بھی ہوں عنصری وقت جو محمود ہے تو　　　میں بھی ہوں ناز سلف تو ہے اگر فخر اول

جوش واثر میں ڈوبے ہوئے اس قصیدے سے علامہ شبلی کے دوسرے قصائد قصیدہ اردو ۱۸۹۳، قصیدہ اردو ۱۸۹۴، قصیدہ مدح سلطان عبد الحمید خاں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مسدس: علامہ شبلی کو مسدس کی صنف سے بڑی دلچسپی تھی، دوسرے اصناف سخن میں بھی وہ مسدس کا انداز اختیار کرتے تھے، ان کا قومی مسدس جو تماشائے عبرت میں پیش کیا گیا تھا خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ۱۴ بند پر مشتمل یہ مسدس حالی کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے، بلکہ بعض

نقادوں کی نظر میں یہ مسدس حالی سے بہتر ہے۔

ایک بند ملاحظہ ہو:

مرو وشیراز وصفاہاں کے وہ زیبا منظر
بیت حمراء کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر وغرناطہ وبغداد کا اک اک پتھر
اور وہ دلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر اب تک

غـزل: علامہ شبلی اصلاً نظموں کے شاعر تھے، البتہ کبھی کبھی وہ زلف غزل بھی سنوار لیا کرتے تھے، ان کی ابتدائی دور کی چند غزلیں مکاتیب وغیرہ میں محفوظ رہ گئی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کہنے پر پوری دسترس رکھتے تھے تاہم جس طرح انھوں نے اپنی اردو شاعری کو لائق اعتناء نہیں خیال کیا، اسی طرح اپنی اردو غزلوں کو بھی اہمیت نہیں دیتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے دیوان میں ان کی غزلوں کو مولانا سید سلیمان ندوی نے جگہ نہیں دی۔

ان کی جو غزلیں دستیاب ہیں ایسا نہیں ہے کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے، ہوسکتا ہے کہ بعض ثقہ حضرات کی نظر میں ایسا اس لئے ہو کہ یہ علامہ شبلی کے شایان شان نہیں کیوں کہ ان میں وہی حسن وعشق اور زلف وخال وخط کا بیان ہے جو روایتی غزل کا اصل سرمایہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزل اپنے دائرے ہی میں رہے تو غزل ہے، اسے نظم یا قومی ترانہ بنانا اس کے ساتھ زیادتی ہے، غالباً علامہ شبلی کا بھی یہی خیال تھا، ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں تھا یا دیدہ خوں نابہ فشاں تھی شب ہجر
ان کو واں مشغلہ انجمن آرائی تھا
انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رخ پیہم
جس طرف بزم میں وہ کافر ترسائی تھا
بھلی تھی تقدیر یا بری تھی یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بتوں کو سجدے کئے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا

گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے　　یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
سبزہ باغ بھی بیدار نہ ہونے پائے　　چپکے وہ آتے ہیں گلگشت کو اے بادِ صبا

واں سے کیا جانیے کیا لائی ہے　　آہ کو سوئے اثر بھیجا تھا
مژدۂ وصل صبا لائی ہے　　شبلی زار سے کہہ دے کوئی

ان اشعار سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی غزلیں روایتی قسم کی ہیں، البتہ اس میں وہ واردات حسن وعشق کو خوبی سے نبھاتے ہیں اور وصل وصال اور ہجر وفراق کے رموز وآداب کو فطری طور پر نبھاتے ہین اور یہی ان کی غزلوں کی خوبی ہے۔

قطعات: علامہ شبلی نے قطعات بھی کہے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ استعارات سے کام لے کر انھوں نے بڑی بڑی باتین کہہ دی ہیں، جن کے نثر میں بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا، اپنی پوری زندگی اور کاموں کو ایک قطعہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

مجھے چند مقیم آستان غیر ہونا تھا　　عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا　　مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم

اسی طرح سیرت النبی ﷺ کی تالیف وتدوین کے بارے میں یہ قطعہ کہا ہے:

دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے　　فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالم
کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے　　صدا بہ بارگاہِ عالم قدوس سے آئی

سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کے عزم مصمم اور والی بھوپال کے تعاون کا ذکر ایک قطعہ میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف وتنقیدِ روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے میری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے

قطعات کی مروجہ تعریف پر یہ پورے نہیں اترتے انہیں مختصر نظم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے، تاہم یہ ایک طرز تو ضرور ہے، جس میں اگر شعراء نے طبع آزمائی کی ہوتی تو یقیناً اردو ادب میں ایک اضافہ ہوتا۔

جدید مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں: علامہ شبلیؒ سے پہلے مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں لکھنے کا عام رواج نہ تھا، انھوں نے اس کا آغاز کیا اور اس رنگ و آہنگ اور لب و لہجے میں یہ نظمیں کہیں، جس کی مثال اس سے پہلے کے ذخیرہ ادب میں نہیں ملتی، مولانا سید سلیمان ندوی نے کلیات شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:-

''مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو نئے سلسلے شروع کئے جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں اور نہ اب تک ان کی تقلید کی جا سکی، ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا، دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کے بہترین نمونے پیش کئے، اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو مگر مولانا کی ان نظموں نے یہ دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے۔''

ان نظموں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں تاریخ کی سچائیاں ہیں اور بیان واقعہ میں کہیں تخیل اور مبالغے سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ایک حقیقت شعار مورخ کی طرح پورے واقعہ کو نظم کیا گیا، واقعیت کے ساتھ شعریت، طرز ادا کی چستی، اثر انگیزی اور استعارات کی نازک خیالی بھی موجود ہے، سلاست و روانی بھی کہیں متاثر نہیں ہوتی، ان کی آخری نظم ''اہل

بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی'' ہے، بطور مثال پیش کی جاتی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ علامہ شبلی کی تاریخی شاعری کس رتبہ کی تھی:

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح شام تھا
آخر گئیں جناب رسول خداؐ کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذنِ عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضورؐ نے — کل کس لئے تم آئیں تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منھ سے کہہ سکیں — حیدر نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا ''کہ غریبانِ بے وطن — جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں — میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق — جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاکؓ رہ گئیں — جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا
یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی — یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

اس کے علاوہ مساوات فاروقیؓ عدل جہانگیری، خواتین عرب کا ثبات، ایثار کی اعلیٰ ترین مثال وغیرہ ان کی بلند پایہ تاریخی نظمیں ہیں جو تاثیر و تأثر میں ڈوبی ہوئی ہیں اور یہی تاثیر علامہ شبلی کی شاعری کی روح ہے۔ انھیں نظموں کو دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد نے کہا تھا۔

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

سیاسی نظمیں

علامہ شبلی کی اردو شاعری میں ان کی سیاسی نظمیں سب سے زیادہ اہم ہیں، وہ نہ صرف ان کا بلکہ شعروادب، تاریخ وسیاست کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں، ان نظموں میں سب سے اہم اور قابل ذکر وہ نظم ہے جو انھوں نے شہر آشوب اسلام کے نام سے لکھی تھی اور جو رفاہ عام لکھنؤ کے اجلاس میں پڑھی گئی تھی۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردیئے ٹکڑے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ جب یہ نظم پڑھی گئی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک ماتم برپا ہو گیا تھا۔ بلا شبہ اس وقت کے عالم اسلام کے جو حالات تھے اس نے مسلمانوں کو سراپا جوش واضطراب بنادیا تھا، ایک طرف اٹلی نے ترکی پر حملہ کر کے طرابلس چھین لیا تھا تو دوسری طرف بلقان نے بھی ترکی پر حملہ کر کے اس کو بڑا نقصان پہنچایا تھا، اس سے مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ ہو گئے تھے، اس زمانے میں شبلی کے علاوہ شاید ہی کسی نے عالم اسلام کی صورت حال اس پرسوز اور دردانگیز لہجے میں بیان کی ہو، چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

زوال دولت عثماں زوال شرع ملت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید وگلبانگ اذاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
کہیں اڑکر یہ دامان حرم کو بھی نہ چھوآئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن وامان شام ونجد و قیرواں کب تک

ان کی سیاسی نظموں میں خیر مقدم ڈاکٹر مختار انصاری بھی ایک بڑی پر اثر نظم ہے، ڈاکٹر انصاری جنگ بلقان میں طبی وفد لے کر گئے تھے، وہ واپس آئے تو علامہ شبلی ممبئی میں تھے، اس موقع پر انھوں نے یہ نظم لکھی اور خیر مقدمی جلسے میں پڑھی گئی، ایک بند ملاحظہ ہو:

مسلمانوں کے تم نے طالع واژدون بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنان بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈ اسٹوں بھی دیکھے ہیں

آخر میں فرماتے ہیں:

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہوکر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے انہدام اور مسلمانوں پر گولیاں برسانے کی وجہ سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، اس پر علامہ شبلی نے کئی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں، ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کل مجھ کو چند لاشہ بے جا نظر پڑے ۔۔۔ دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور تھے
کچھ طفل خورد سال کہ جو چپ ہیں خود مگر ۔۔۔ بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادہ فنا ۔۔۔ جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں

اس کے علاوہ متعدد سیاسی نظمیں ایسی ہیں جو اردو شعر وادب کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ سے متعلق جو نظمیں کہی ہیں، اس سے ان کے دلی جذبات واحساسات کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

علامہ شبلی کی اردو شاعری کے اس مختصر جائزہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر انھوں نے اس کی طرف توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے معاصرین میں سب پر فائق ہوتے، باوجود اس کے ان کی اردو شاعری اور خاص طور سے تاریخی، قومی اور سیاسی نظمیں کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی۔

تصانیف شبلی کے تراجم

علامہ شبلی کی شخصیت جامع کمالات تھی، انھوں نے مدۃ العمر علم وفن کی جو گراں قدر اور عظیم الشان خدمت انجام دی اس کا آج سارا زمانہ معترف ہے۔ ے

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

علامہ شبلی نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''بتیس برس (۱۸۸۲ء۔۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پر شور رکھا''۔(۱)

اس بتیس برس کی مدت میں انھوں نے ایسی معرکہ آرا کتابیں اور گراں مایہ مقالات سپرد قلم کئے جن کی عظمت و بلند پائیگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی کتابوں کے سیکڑوں ایڈیشن طبع ہوئے اور وہ نہایت مقبول ہوئیں بلکہ متعدد کتابوں کے ترجمے بھی دنیا کی مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، پشتو اور ملیالم وغیرہ میں ہو چکے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق تو ادا کیا ہی اس کے علاوہ تعبیر و بیان کا ایسا انوکھا اور اچھوتا پیرایہ اختیار کیا کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے ذریعہ علامہ شبلی کا فیض ابھی تک جاری ہے اور ان کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کا یہ بیان سراسر غلط ثابت ہوا کہ:

> ''مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے، زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکا، وہ بہت سخت مزاج ہے، مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ میں ہے، ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ

مدت کے بعد وہ صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔" (۲)

یقیناً زمانہ کے دست برد سے کوئی نہیں بچ سکا، بقائے دوام کا دعوی کس کو زیب دیتا ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ علامہ شبلی کی تصانیف پر ایک صدی بلکہ بعض تصانیف پر ایک صدی سے زیادہ مدت گذرنے کے بعد بھی شب وروز کی گردشوں سے پھپھوندیں نہیں لگیں اور دنیائے علوم وفنون میں نئے نئے انقلابات رونما ہونے کے باوجود ان کی کتابوں کے سیکڑوں ایڈیشن طبع ہو کر حسن قبول کی سند حاصل کرتے جارہے ہیں اور ان سے استفادے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، ان کی کتابیں کتب خانوں کے ساتھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے ماہرین اور اہل علم کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں اور غیر زبانوں میں علامہ شبلی کی تصانیف کے ترجمے ہورہے ہیں، اس مقالہ میں ان تراجم کا ایک اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ تصانیف شبلی کی مقبولیت اور عظمت وبلند پائیگی کا اندازہ ہوسکے۔

۱۔ تاریخ بد، الاسلام

علامہ شبلی کے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ان کے قلم سے جو تحریر سب سے پہلے نکلی وہ تاریخ بدء الاسلام تھی، عربی زبان میں یہ کتاب درسی ضرورت کے پیش نظر سر سید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی (۳) یہ کتاب اس وقت کے ایم۔اے۔او۔(M.A.O. College) کالج کے نصاب میں شامل رہی، اردو، وفارسی میں اس کے کئی ترجمے ہوئے۔

۱۔اس کا پہلا فارسی ترجمہ سر سید احمد خاں کی فرمائش پر علامہ شبلی کے شاگرد اور ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی نے کیا تھا (۴) جو مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء۔۸۶) میں شائع ہوا، اس کا ایک ایڈیشن تجارتی پریس علی گڑھ نے بھی شائع کیا۔

۲۔اس کا اردو ترجمہ میمونہ سلطان شاہ بانو (بیگم نواب حمید اللہ خاں بھوپال) نے آغاز اسلام کے نام سے کیا، یہ اصل عربی کتاب کے بجائے مولانا فراہی کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۱۵ء میں مطبع سلطانی ریاست بھوپال سے شائع ہوا۔اس کا ایک نسخہ کتب خانہ

دارالمصنفین میں موجود ہے۔

آغاز اسلام کے دو ایڈیشن دہلی سے بھی شائع ہوئے ایک مہتاب پریس دہلی سے شائع ہوا جبکہ دوسرا ایڈیشن رنگین پریس دہلی نے ۱۳۴۳ھ میں شائع کیا۔

۳۔ تاریخ بدء الاسلام کا ایک اور اردو ترجمہ حیات النبیؐ کے نام سے شائع ہوا ہے یہ ترجمہ محمد حمید اللہ کے قلم سے ہے اور رحمانی پریس دہلی سے شائع ہوا ہے۔

۲۔ سیرۃ النعمان

علامہ شبلی کو امام ابوحنیفہ کی ذات سے بڑی عقیدت و محبت تھی جس کی بنا پر ان کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی نے انھیں نعمانی کی نسبت دی (۵) جوان کے نام کا جزو لاینفک ہوگئی، امام اعظم سے عقیدت و شیفتگی کا ایک مظہر یہ تصنیف بھی ہے جو دراصل ان کے سلسلہ ناموران اسلام کی ایک کڑی ہے، یہ ۱۸۹۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں ایم۔ اے۔ او کالج (M.A.O.Collage) علی گڑھ کی طرف سے پہلی بار شائع ہوئی، ایک صدی کا عرصہ گذر گیا اس وقت سے اب تک مسلسل طبع ہو رہی ہے اور انگریزی میں بھی منتقل ہو چکی ہے اسے انگریزی قالب جناب ہادی حسین نے عطا کیا ہے، جسے ۱۹۷۸ء میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور نے شائع کیا۔

۳۔ الفاروق

یہ علامہ شبلی کی نہایت معرکہ آراء اور اردو زبان کی مقبول ترین کتاب ہے، علامہ شبلی نے اس کی تصنیف و تالیف کے لئے ممالک اسلامیہ کا سفر کیا اور وہاں کے متعدد کتب خانوں کی نادر و کمیاب کتابوں سے استفادے کے بعد اس کی تالیف کی خود علامہ شبلی کو اپنی تمام تصنیفات میں الفاروق سب سے زیادہ پسند تھی (۶) الفاروق جنوری ۱۸۹۹ء میں مطبع نامی کانپور سے پہلی بار طبع ہوئی، اس وقت سے آج تک برابر طبع ہو کر اہل علم کی تشنگی بجھا رہی ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، پشتو اور ملیالم میں ترجمہ ہو کر ان کے حلقوں میں بھی مقبول و متداول ہے۔

۱۔ الفاروق کا سب سے پہلے ترکی زبان میں ترجمہ ہوا، ترکوں سے علامہ شبلی کو خاص محبت تھی، محمد عمر رضا آفندی نے الفاروق کا ترکی میں ترجمہ کر کے اس محبت کا حق ادا کیا ہے، جسے آمدی مطبع سی استنبول نے ۱۹۲۶ء مطابق ۱۳۴۵ھ میں حضرت عمرؓ کے نام سے شائع کیا اس ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن کون طوغدی مطبع سی استنبول نے ۱۹۲۸ء مطابق ۱۳۴۷ھ میں شائع کیا، یہ دونوں مطبوعہ نسخے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

۲۔ اس کے بعد الفاروق کا مالاباری (ملیالم) زبان میں ترجمہ ہوا، یہ ترجمہ جناب عبدالسلام وکم کے قلم سے ہے، اسے اسلامیہ پبلشنگ ہاؤس وکم ٹراونکور نے وی۔ وی پریس ترویندرم سے طبع کرا کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا، یہ مطبوعہ نسخہ بھی دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۳۔ علامہ شبلی اور ان کی تصانیف کے قدرداں اور مرتبہ شناس امراء ورؤسا اور فرماں روایان ریاست بھی تھے، الفاروق کی تالیف وتکمیل میں سرکار آصفیہ حیدرآباد کا اشتراک شامل تھا اور وہ سلسلہ آصفیہ میں داخل تھی، اسی طرح سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں بیگم بھوپال کی دلچسپی وتوجہ سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں علامہ شبلی کا یہ قطعہ بیگم صاحبہ کی علم نوازی اور معارف پروری کو زندہ جاوید کر گیا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اسکے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

علامہ شبلی کے ابتدائی رسالہ بدء الاسلام کے اردو ترجمے کی سعادت نواب حمید اللہ خاں بھوپال کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو کے حصہ میں آئی، اسی طرح الفاروق کے فارسی ترجمہ کی

سعادت جناب اسد اللہ خاں صاحب افغانستان کی والدہ اور محمد نادر خاں بادشاہ افغانستان کی ہمشیرہ عزت مآب علیا جناب کا مقدر بنی، اس کی تصحیح و ترتیب کا کام جناب نجف علی عاصی جلال پوری نے انجام دیا، جسے پہلے قندھار سے حاجی عبد الستار نے شائع کیا پھر اس کا دوسرا ایڈیشن مسلم پرنٹنگ پریس لاہور نے ۱۳۵۱ھ میں شائع کیا، یہ دوسرا ایڈیشن کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہے۔

۴۔ الفاروق شائع ہوئی تو اسے انگریزی میں منتقل کرنے کی کئی لوگوں نے کوشش کی سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں علامہ شبلی کے شاگرد (۷) مولانا ظفر علی خاں نے شمس العلما مولانا سید علی بلگرامی اور مولوی عزیز مرزا کی تحریک پر اس کام کا آغاز کیا اور الفاروق کے ایک حصے کا ترجمہ کیا (۸) جسے ۱۹۳۹ء میں شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا، اس ترجمہ کے اب تک چار ایڈیشن علی الترتیب ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۷ء، ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکے ہیں، پانچواں ایڈیشن عماد پبلی کیشن دہلی نے شائع کیا۔

الفاروق کا انگریزی ترجمہ شیخ عطاء اللہ صاحب لاہور نے بھی شروع کیا تھا مگر وہ اسے پایہ تکمیل تک نہ پہونچا سکے (۹) البتہ دوسرا انگریزی ترجمہ جناب محمد سلیم کے قلم سے نکلا، یہ ترجمہ بھی شیخ محمد اشرف لاہور ہی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا، پھر ۱۹۶۲ء میں وہیں سے دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا۔

۵۔ الفاروق کو پشتو زبان میں بھی ترجمہ ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے جو پشتو اہل قلم جناب غلام قادر کا کارنامہ ہے، یہ ترجمہ ۱۹۴۹ء میں کراچی سے شائع ہو چکا ہے، راقم الحروف کی نظر سے یہ ترجمہ نہیں گذرا۔

۶۔ علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ الفاروق کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تا کہ عربی داں طبقہ کے لئے اس سے استفادہ آسان ہو مگر ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں تو پوری نہ ہو سکی تاہم اب بحمد اللہ ایک صدی بعد ان کی یہ تمنا پوری ہوئی، جناب دکتور سمیر عبد الحمید ابراہیم استاذ جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ نے عربی مبین میں الفاروق کو منتقل کیا ہے جسے مکتبہ دار السلام ریاض

نے ۱۹۹۹ء میں نہایت خوب صورت اور دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ان ترجموں اور متعدد اشاعتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ الفاروق کی مقبولیت کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کے کس قدر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے، ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہندی میں بھی کیا جائے تا کہ برادران وطن کو بھی اس سے استفادے کا موقع ملے اور انھیں یہ اندازہ بھی ہو کہ اسلام اور اسلامی تاریخ کس چیز کا نام ہے۔

علامہ شبلی نے اپنے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات کا آغاز کیا جس میں الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم اور الغزالی جیسی معرکہ آراء کتابیں شامل ہیں اہل فارس نے ان کتابوں سے بھی دلچسپی لی اور اس سلسلہ کی دو کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۴۔علم الکلام

اس کتاب کا تاریخ علم الکلام کے نام سے جناب سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے فارسی میں ترجمہ کیا، جو ۱۳۲۸ھ ش میں تہران سے شائع ہوا ۱۳۳۰ھ ش میں تہران ہی سے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔

۵۔ الغزالی

علامہ شبلی کی مشہور کتاب الغزالی جس میں امام غزالی کے حالات و سوانح، اور کارناموں کی تفصیل شرح وبسط کے ساتھ قلم بند کی گئی ہے، اسے جناب محمد منصور الدین صاحب بی۔اے۔ نے بنگالی زبان میں ترجمہ کیا جو مشہور بنگالی اسلامی رسالہ ''شے تک'' میں قسط وار شائع ہوا۔ ضرورت ہے کہ اسے حاصل کر کے یکجا کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

۶۔سوانح مولانا روم

اس کتاب کو بھی جناب سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہی نے فارسی میں منتقل کیا جو ۱۳۳۲ھ ش میں شرکت چاپ رنگین تہران۔ ایران سے شائع ہوا۔

۷۔شعر العجم

شعر العجم اپنے موضوع پر ایک مایہ ناز اور شاہکار تصنیف ہے اس کی مقبولیت کا اندازہ

اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک و بیرون ملک سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

لٹریری ہسٹری آف پرشیا کے مشہور مصنف پروفیسر براؤن (E.G.Browne) اس کی خوبیوں کے معترف ومداح تھے، انھوں نے اپنی کتاب میں اس سے جا بجا استفادہ کیا ہے، ان کی تمنا تھی کہ کاش شعر العجم فارسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو جاتی، ان کی یہ تمنا پوری ہوئی اور اس کی تمام جلدوں کا فارسی ترجمہ ہوا اور ایران اور افغانستان دونوں جگہوں سے شائع ہوا۔

شعر العجم کی پانچوں جلدوں کے فارسی ترجمہ کی سعادت جناب سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے حاصل کی، جو ۱۳۱۶ھ ش۔ ۱۳۱۷ھ ش۔ ۱۳۱۴ھ ش میں کتب خانہ ابن سینا تہران سے شائع ہوئے یہ ترجمے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

شعر العجم کے فارسی ترجمہ کی چند جلدوں کا تہران سے دوسرا ایڈیشن بھی چھپا، مثلاً جلد اول ۱۳۱۶ھ ش کے بعد دوبارہ ۱۳۳۵ھ ش میں شائع ہوئی اسی طرح جلد سوم کا ترجمہ ۱۳۱۴ھ ش کے بعد ۱۳۳۶ھ ش میں اور جلد چہارم کا ۱۳۱۴ھ ش کے بعد ۱۳۲۶ھ ش میں دوبارہ شائع ہوا۔

کابل میں منصور انصاری نے شعر العجم کی تین جلدوں کو فارسی میں منتقل کیا چنانچہ جلد اول۔ دوم اور پنجم کے ترجمے کابل سے علی الترتیب ۱۳۰۶ھ ش۔ ۱۳۰۶ھ ش۔ ۱۳۰۴ھ ش میں شائع ہوئے۔

ان کے علاوہ چند دوسرے اہل علم اور ارباب ذوق نے بھی شعر العجم کی بعض جلدوں کا فارسی ترجمہ کیا مثلاً افغانستان کے مشہور شاعر سرور خاں گویا نے جلد سوم کو فارسی کا جامہ پہنایا جسے انجمن ادبی کابل نے ۱۳۱۵ھ میں شائع کیا۔ اسی طرح برہان الدین کشلکی نے جلد چہارم کو فارسی قالب دیا جو ۱۳۰۶ھ میں لاہور سے شائع ہوا۔

۸۔ سیرۃ النبی

یہ علامہ شبلی کی سب سے زیادہ مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے جسے وہ اپنی

زندگی کا حاصل اور وسیلہ نجات خیال کرتے تھے (۱۰) اس میں شبہ نہیں کہ سیرۃ النبی کتب سیرت کے پورے ذخیرہ میں ایک بہت ممتاز تصنیف ہے اس نوعیت کی جامع سیرت کسی زبان میں حتی کی عربی زبان میں بھی نہیں لکھی گئی (۱۱) اس کی تصنیف پر پون صدی سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے تاہم ابھی تک اس کی شہرت و مقبولیت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں اور کئی زبانوں مثلاً عربی، انگریزی، ترکی اور پشتوں وغیرہ میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ سیرۃ النبی کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تا کہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے (۱۲) چنانچہ سیرۃ النبی کی طباعت واشاعت کے آغاز ہی سے اہل علم اور ارباب ذوق نے اس کے انگریزی ترجمہ کی کوششیں شروع کر دیں، سب سے پہلے علامہ شبلی کے شاگرد مولانا محمد علی جوہر نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور مولانا سید سلیمان ندوی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ سیرۃ النبی کی جو کاپیاں چھپتی جائیں وہ ان کے پاس بھیجتے جائیں تا کہ طباعت کے ساتھ ترجمہ بھی ہوتا جائے (۱۳) سید صاحب نے اس کا اہتمام بھی کیا مگر مولانا جوہر اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے یہ کام انجام نہیں دے سکے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد اہل علم نے انگریزی ترجمہ کی اجازت چاہی جسے سید صاحب نے بخوشی منظور بھی کر لیا، خود سید صاحب لکھتے ہیں:-

> "سیرت کے انگریزی ترجمہ کا خیال بھی مدتوں سے ہے اور کئی صاحبوں نے اس کی اجازت بھی مانگی اور دی گئی مگر پورا کسی نے نہیں کیا اسی اثنا میں خود اپنے یہاں اس کام کو شروع کیا گیا مگر کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ یہ کام رک گیا اب لاہور کے ایک ممتاز صاحب دل اور صاحب قلم خواجہ عبدالحمید سکریٹری اسلامک ریسرچ سوسائٹی نے ہمت کی اور اس کے دیباچہ کا انگریزی ترجمہ خدام الدین کے انگریزی پرچے "اسلام" میں شائع کیا اور اب وہ ہمت کر رہے ہیں کہ پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کریں خدا کرے یہ کام بھی تکمیل کو پہونچے۔" (۱۴)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

''پاکستان میں کئی اصحاب نے سیرت کے انگریزی ترجمہ کی اجازت چاہی جو دیدی گئی ایک وکیل صاحب نے جن کا نام یاد نہیں رہ گیا ایک انگریز کی مدد سے پہلی جلد کا ترجمہ شروع بھی کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں انھوں نے خط و کتابت بھی کی لیکن پھر اس کا انجام نہیں معلوم ہوا۔'' (۱۵)

۱۔انگریزی ترجمہ کی یہ کوششیں اگرچہ بارآور ثابت نہ ہوسکیں تاہم بعد میں یہ سعادت جناب فضل الرحمٰن صاحب نے حاصل کی، انھوں نے سیرۃ النبی کی دونوں جلدوں کو انگریزی قالب عطا کیا جسے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے علی الترتیب ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

۲۔سیرۃ النبی کا دوسرا انگریزی ترجمہ طیب بخش بدایونی نے کیا جو قاضی پبلشرز لاہور سے ۱۹۷۹ء۔۱۹۸۰ء میں شائع ہوا اس ترجمہ کو دہلی کے ادارہ ادبیات دلی نے بھی ۱۹۷۹ء میں شائع کیا، ۱۹۸۳ء میں یہیں سے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا، یہ ترجمے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

۳۔انگریزی ترجمہ کی طرح پشتو زبان میں بھی سیرۃ النبیؐ کے کئی ترجمے ہوئے برہان الدین کشلکی نے ابتدائی دو جلدوں کا ترجمہ کیا جو پشتو تولنہ کابل سے علی الترتیب ۱۳۲۶ھ اور ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوئے اور دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

۴۔پہلی اور دوسری جلد کو جناب عزیز الرحمٰن سیفی نے بھی پشتو میں منتقل کیا، پشتو تولنہ کابل ہی سے ۱۳۵۰ھ اور ۱۳۵۴ھ میں یہ دونوں حصے شائع ہوئے کتب خانہ دارالمصنفین میں اس کے نسخے بھی موجود ہیں۔

۵۔جلد اول کا ایک اور پشتو ترجمہ محمد اسرائیل کے قلم سے ہے اسے پشتو اکیڈمی پشاور نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

۶۔سیرۃ النبی کا مراٹھی زبان میں ترجمہ جناب منشی محمد اسماعیل بھالدار نے کیا تھا مگر یہ

معلوم نہ ہو سکا کہ آیا وہ شائع ہوا یا نہیں۔

۷۔ سیرۃ النبی کو تمل زبان میں بھی منتقل ہونے کا شرف حاصل ہے اے جناب بی۔ داؤد شاہ (بی۔اے) اور حافظ محمد یوسف فاضل باقوی نے تمل زبان کا لباس عطا کیا، یہ ترجمہ کتب خانہ دارالاسلام مدراس نے گارڈن پریس سے طبع کرا کے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا، یہ نسخہ بھی کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔

۸۔ سیرۃ النبی کا ترکی ترجمہ علامہ شبلی کی تحریروں کے عاشق جناب محمد عمر رضا آفندی نے کیا، جسے کتب خانہ آثار علمیہ قسطنطنیہ نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

۹۔ سیرۃ النبیؐ کے عربی ترجمہ کی متعدد کوششیں کی گئیں علامہ شبلی کی طرح خود مولانا سید سلیمان ندوی کی بھی آرزو تھی کہ سیرۃ النبی کو عربی میں منتقل کیا جائے اس کے لئے وہ مصر کے سفر کا ارادہ بھی رکھتے تھے تا کہ وہاں کچھ دنوں رہ کر طباعت واشاعت کی نگرانی کرسکیں (۱۶) مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ اسی زمانہ میں متعدد اہل علم نے عربی ترجمہ کی طرف نہ صرف توجہ دلائی بلکہ متعدد اصحاب علم وفن نے ترجمہ کرنے کے لئے اجازت بھی مانگی، مصر یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر عبدالوہاب عزام نے جو اردو اور فارسی کے استاذ تھے سیرۃ النبی کے عربی ترجمہ کی اجازت چاہی جسے سید صاحب نے بخوشی منظور کر لیا، عبدالوہاب عزام نے سید صاحب کو جو خط لکھا تھا اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں نے آپ کی سیرۃ نبویہ کا ترکی ترجمہ پڑھا تو اس کو میں نے اس لائق پایا کہ خود قرآن کی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے اس لئے میں نے اور چند ہندوستانی بھائیوں نے ارادہ کیا ہے کہ ہم عربی میں اس کا ترجمہ کریں۔'' (۱۷)

یہ اطلاع سید صاحب کے لئے کسی بڑی خوشی سے کم نہ تھی چنانچہ انھوں نے قارئین معارف کو بھی دسمبر ۱۹۳۳ء کے شذرات کے ذریعہ یہ خوش خبری سنائی کہ مصر کے چند ادبا نے عربی ترجمہ کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے (۱۸) مگر پھر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ترجمہ کا کام ہوا کہ نہیں

بعد میں مصر سے اس کام کی اجازت ندوۃ العلماء کے ایک فاضل مولانا محمد اسماعیل ندوی مدراسی نے مانگی جسے ارباب دارالمصنفین نے بخوشی منظوری دے دی، کچھ دنوں تک انھوں نے خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا (۱۹) اس کے بعد مولانا مدراسی مصر سے الجزائر منتقل ہوگئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوگیا، ان کے علمی متروکات جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے حصے میں آئے جس میں سیرۃ النبی جلد اول کا عربی ترجمہ بھی تھا، مولانا ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی صاحب نے اس کا عکس حاصل کیا اور دارالمصنفین کے اس وقت کے ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے حوالہ کیا، انھوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تاکہ وہ اپنے اثرورسوخ اور وسائل و ذرائع سے اسے جلد از جلد شائع کرادیں حسن اتفاق اسی زمانہ میں رابطہ ادب اسلامی کا ایک سمینار لکھنؤ میں ہوا جس میں شرکت کے لئے قطر کے وزیر اوقاف جناب عبداللہ ابراہیم انصاری لکھنؤ تشریف لائے تھے انھوں نے سیرۃ النبی کے عربی ترجمہ پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اس کی دوسری جلدوں کو بھی عربی میں منتقل کردیا جائے اخراجات کی ذمہ داری خود انھوں نے اپنے سر لے لی مگر پھر بھی وہ شائع نہ ہوسکا اور جناب عبداللہ ابراہیم انصاری صاحب اس دنیا سے رخصت بھی ہوگئے مولانا مدراسی کا ترجمہ سیرۃ النبیؐ ابتک شائع نہ ہوسکا ہے۔

کئی برس کے لیت ولعل کے بعد اس کا مسودہ ندوہ سے دارالمصنفین آیا ہے، کمپوزنگ ہوچکی ہے، امید ہے جلد ہی شائع ہوگا۔

۹۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر

۱۹۰۶ء میں علامہ شبلی نے مولانا محمد علی جوہر کی خواہش پر بڑودہ کا سفر کیا، وہاں مولانا جوہر نے درخواست کی کہ عالمگیر پر عائد الزامات واتہامات کے ردوابطال پر ایک مفصل مضمون ارقام فرمائیں (۲۰) چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد علامہ شبلی نے عالمگیر پر مسلسل مضامین لکھنا شروع کیا، علامہ شبلی اس زمانہ میں ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے مدیر تھے یہ سلسلہ مضامین اسی میں شائع ہوکر مقبول ہوا (۲۱) ۱۹۰۹ء میں کتابی صورت میں طبع ہوا، اب تک اس کے متعدد ایڈیشن مختلف

ناشروں نے شائع کیے ہیں، اس کی اہمیت کے پیش نظر مولانا محمد علی جوہر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے (۲۲) مگر وہ یہ کام اخیر تک نہ کر سکے اس زمانہ میں اس کام کی سعادت ڈاکٹر سید محمود نے پائی علامہ شبلی کی اجازت سے انھوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ یا خلاصہ لندن میں شائع کیا (۲۳)

۱۹۸۱ء میں دارالمصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اسے انگریزی میں منتقل کیا جو عالمگیر کے نام سے ادارہ ادبیات دلی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اور دستیاب ہے۔

مقالات

علامہ شبلی کی تصانیف ہی کی طرح ان کے گراں مایہ مقالات بھی بہت مقبول ہوئے اور چند مقالات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔

۱۰. الجزیة

یہ علامہ شبلی کا مشہور تحقیقی مقالہ ہے جس کو انھوں نے ۱۸۸۹ء میں لکھا تھا، یہ مطبع مجتبائی لاہور سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا، اولاً خود علامہ شبلی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۱۲ھ۔ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا، سر سید احمد خاں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا تھا۔ (۲۴) باوجود تلاش بسیار کے وہ دستیاب نہ ہو سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ یہ ترجمہ کس نے کیا تھا اور کہاں سے شائع ہوا تھا، اس کا ایک اور انگریزی ترجمہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے کیا تھا جو اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا۔

الجزیہ کو مولوی شمس الدین صاحب (دھولیا) نے مراٹھی زبان میں منتقل کیا جو مراٹھی رسالہ شکشک میں شائع ہوا۔

۱۱. کتب خانہ اسکندریہ

یورپ نے اس الزام کو بڑی شہرت دی کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے مصر و اسکندریہ کو فتح کیا تو انھوں نے وہاں کے قدیم یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے قائم تھا جلا کر خاک کر دیا اس بے سروپا الزام کے جواب میں علامہ شبلی نے یہ دلائل

ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ الزام سراسر غلط ہے اور فتح اسکندریہ سے پہلے ہی اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اس کی بربادی میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا شریک تھے۔

علامہ شبلی کا یہ محققانہ مقالہ بھی بہت مقبول ہوا اور متعدد بار مختلف اداروں سے کتابی صورت میں شائع ہوا، مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا (۲۵) اس مضمون کو انگریزی کا جامہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے پہنایا یہ ترجمہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے مگر اس سے سن طباعت اور ناشر کا پتہ نہیں چلتا۔

اس محققانہ مضمون کو فارسی میں بھی منتقل کیا گیا جناب سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے یہ کام انجام دیا جو تہران سے ۱۳۱۵ ھ ش میں شائع ہوا۔

۱۲۔ الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی

علامہ شبلی نے مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا مفصل تنقیدی جائزہ لے کر اس کی غلط بیانیوں کی تردید کی ہے، علامہ شبلی کی اس عربی تحریر کے بعض اجزاء اولاً علامہ رشید رضا مصری کے رسالہ المنار میں شائع ہوئے اور پھر ہندوستان اور مصر سے کتابی صورت میں ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئے (۲۶) اردو زبان میں خود علامہ شبلی نے اس کا خلاصہ کیا جو مقالات شبلی جلد چہارم میں شامل ہے۔

۱۳۔ جہانگیر

علامہ شبلی نے جہانگیر اور تزک جہاں گیری کے عنوان سے ایک مفصل تاریخی مضمون لکھا ہے جو مقالات شبلی جلد چہارم میں شامل ہے، اس تاریخی مضمون کو بھی جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی میں منتقل کیا (۲۷)

تصانیف شبلی کے تراجم کے اس مختصر سے جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کی مقبولیت کا دائرہ کتنا وسیع تھا اور اس کے کس قدر ہمہ گیر اثرات مرتب

ہوئے۔(۲۸) ☆

حوالے

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء ص ۱

(۲) مولوی عبدالحق۔ مقدمہ خطوط شبلی۔ ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال (س۔ن) ص ۲۶

(۳) مقالات یوم شبلی۔ مرتبہ حافظ نذر احمد مسلم اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۱۱

(۴) مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی۔ مختصر حیات حمید۔ دائرہ حمیدیہ سرائے میر ص ۶

(۵) حیات شبلی ص ۶۹

(۶) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۳۵۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۷۱ء،
علامہ شبلی کا یہ قول سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے کا ہے۔

(۷) عبید اللہ خاں، البصیر شبلی نمبر ص ۷۶۔ اسلامیہ کالج چنوٹ ۱۹۸۷ء

(۸) شذرات سلیمانی حصہ سوم ص ۲۲۵۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ

(۹) البصیر شبلی نمبر ص ۷۶

(۱۰) مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۱۰۱۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء
تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون ''علامہ شبلی کی سیرۃ النبی''مطبوعہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، فروری۔ مارچ ۱۹۹۸ء

(۱۱) شاہ معین الدین احمد ندوی۔ حضرت الاستاذ کی دینی و علمی خدمات۔ معارف سلیمان نمبر ص ۱۷۸۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء

(۱۲) مقالات شبلی جلد ۸ ص ۳۶، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء

(۱۳) مشاہیر کے خطوط ص ۸۵ و ۹۲۔ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء

(۱۴) ماہنامہ معارف فروری ۱۹۴۰ء

(۱۵) شاہ معین الدین احمد ندوی۔ حیات سلیمان حاشیہ ص ۵۷۴۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء

(۱۶) عبدالعزیز میمنی۔ ابوالعلا مالہ و ماعلیہ ص ۵۔ مطبعۃ السلفیہ قاہرہ ۱۳۴۴ھ

(۱۷) حیات سلیمان ص ۴۷۴

(۱۸) شذرات سلیمانی ج ۳ ص ۲۸۔ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۸ء

(۱۹) حیات سلیمان ص ۴۷۴

(۲۰) محمد سرور۔ خطوط محمد علی ص ۵۹۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۴۰ء

(۲۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ایک جائزہ''۔ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ جون ۲۰۰۰ء

(۲۲) خطوط محمد علی، ص ۵۹

(۲۳) حیات شبلی ص ۵۴۴

(۲۴) ایضاً ص ۲۲۷

(۲۵) ایضاً ص ۲۲۶

(۲۶) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی۔ ایک جائزہ۔ سہ ماہی

فکر و نظر اسلام آباد اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۲ء

(۲۷) نیا دور لکھنؤ۔ یادرفتگاں نمبر ص ۱۴۹۔ مدیر امیر احمد صدیقی۔ محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ اتر پردیش، اپریل۔ دسمبر ۱۹۸۸ء

(۲۸) اس مضمون کی تیاری میں کتاب نامہ شبلی از جناب اختر راہی۔ اشاریہ جہان شبلی از ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری مرحوم مشمولہ فکر و نظر شبلی نمبر، علی گڑھ اور منتخب کتابیات شبلی مرتبہ جناب کبیر احمد خاں صاحب مشمولہ الفاروق ایک مطالعہ مطبوعہ ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۲۰۰۲ء سے خاص طور سے استفادہ کیا گیا ہے۔

☆☆☆

علامہ شبلی-علی گڑھ میں

علی گڑھ تحریک جب زوروں پر تھی مولانا شبلی نعمانی اس میں شامل ہوئے، ان کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اس تحریک کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے مہدی حسن کو قرآن پاک حفظ کرانے کے بعد علی گڑھ میں انگریزی تعلیم کے لئے داخل کیا۔ شیخ صاحب ان سے ملنے علی گڑھ گئے تو مولانا شبلی کو بھی ساتھ لے گئے۔ مولانا شبلی نے علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں کی خدمت میں عربی کا ایک قصیدہ پیش کیا جس میں ان کی اور ان کی تحریک کی مدح وتحسین تھی اور دراصل یہی قصیدہ مولانا شبلی کی علی گڑھ تحریک میں شمولیت کا نقطۂ آغاز ہے۔

یہ قصیدہ ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوا(۱) مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں پورا قصیدہ نقل کیا ہے۔ طوالت کے سبب یہاں اس قصیدے کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

> ''بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے، حالانکہ علم ہماری قوم سے رخصت ہورہا ہے۔ ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی، کیوں کہ ان میں نہ علم نظر آتا ہے نہ عمل، ان کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کے لیے تمام راستے بند ہوگئے ہیں۔ مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان نہیں ہے۔ ان کا تمام تر کارنامہ گمراہی اور پریشان رائی ہے آج تم ان کو رنج وغم میں مبتلا دیکھ رہے ہو۔ ان کے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا۔ باوجودیکہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن ان

سے باز نہیں آتے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اُٹھا رہے ہیں۔ خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے کیا اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا، پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لئے کوشش کی خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا، اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا، امام سردار، بہادر، سید، وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا اور وہ بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی، جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کامیابی میں مشغول ہے، اپنے آباء واجداد سے فضائل حاصل کیے اور اس شاہراہ میں ان ہی کے نقش قدم پر چلا، اس کے دادا عرب وعجم کے سردار تھے ان کی موت کا وقت آیا تو صرف یا امتی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا، اسی طرح اس نامور سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا برا کیا۔ اے لوگوں میں بہتر جس کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہوگئی ہے۔ عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں ان سے غمزدہ نہ ہو، ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروانہ کر"۔ (۲)

سرسید سے ابتدائی تعلقات:

اس ملاقات کے ڈیڑھ سال بعد علی گڑھ کالج میں مشرقی زبان کے ایک معلم کی جگہ نکلی۔ مولانا شبلی نے اپنے استاد مولانا فیض الحسن سہارن پوری کی سفارش کے ساتھ اس جگہ کے لیے درخواست بھیجی۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں مولانا کی تقرری اسسٹنٹ عربک پروفیسر کے لیے چالیس روپے ماہوار پر ہوئی اور اس طرح مولانا علی گڑھ تحریک کے گویا باضابطہ رکن ہو گئے۔

علی گڑھ میں مولانا کا قیام کالج سے کچھ دور تھا، اس لیے سرسید احمد خاں سے ملاقاتیں کم ہوتی تھیں لیکن قربت واستفادہ کی خواہش تیز تر ہوتی جارہی تھی، چنانچہ سرسید نے مولانا شبلی کو اپنے مکان کے قریب ہی بلالیا۔ قریب آئے تو ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا اور دونوں

کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا گیا۔

مولانا شبلی نے اسی زمانے میں سرسید کے کتب خانے سے استفادہ شروع کیا جس کے لیے سرسید نے ان کو عام اجازت دے دی تھی۔ مولانا شبلی کی کتب بینی کا یہ عالم تھا کہ الماریوں کے پاس گھنٹوں کھڑے کتابیں دیکھا کرتے اور کبھی اکڑوں بیٹھ جاتے۔ سرسید نے جب یہ حال دیکھا تو مولانا کے لیے ایک کرسی رکھوادی۔ خود مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے''۔ (۳)

مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب ہمیشہ اعتقادی وکلامی مسائل اور مؤرخانہ تحقیق کے غور وخوض میں رہتے اور تحقیق وتدقیق کے لیے انھیں اکثر حدیث وفقہ اور تاریخ وسیر کی کتابوں کے مطالعے کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولانا شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا قائل ہوتے جاتے تھے۔ اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش وجستجو اور جلب روایات کے معتقد ومعترف ہو گئے تھے''۔ (۴)

کالج میں عربی وفارسی کا ذوق:

علامہ شبلی علوم مشرقیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کالج میں جب عربی و فارسی کا درس دینا شروع کیا تو ان سے نہ صرف کالج کے طلبا بلکہ شہر سے آ کر دوسرے اشخاص بھی استفادہ کرتے اور عربی زبان وادب کے نکتے حل کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی جامع العلوم، پرکشش اور فیض رساں شخصیت نے طلبا کے اندر عربی وفارسی کا ذوق پیدا کر دیا۔ مولانا سید

سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''کالج میں عربی زبان کی ترقی اور طلبا میں عربی تحریر وتقریر کا شوق دلانے کیلئے انھوں نے لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی۔ اس لجنۃ الادب میں طلبا بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے اور عربی کے طالب العلم عربی میں تحریریں پڑھتے تھے، نظمیں سناتے تھے اور تقریریں کرتے تھے۔(۵)

مولانا شبلی کو فارسی ادبیات سے بڑی دلچسپی تھی، دراصل ان کے عہد میں فارسی شعرو ادب کا ان سے بڑا کوئی نکتہ شناس نہ تھا، اس سلسلے کی ان کی شاہ کار تصنیف شعرالعجم ہے، مولانا نے علی گڑھ میں بھی فارسی کی بڑی خدمت کی طلبا کو نہ صرف پڑھاتے بلکہ ان میں فارسی زبان وادب سے حقیقی دلچسپی پیدا کردیتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد مولوی مسعود علی محوی لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولانا مرحوم ان نادرالوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھادیتے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم ومغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر اہوا کہ ہم میں سے بعض طلبا فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے۔''(۶)

کالج میں درس قرآن:

مولانا کالج میں عربی وفارسی کے ساتھ قرآن پاک اور دینیات کا بھی درس دیتے رہے اور اس سے کالج کے ماحول میں ایک نئی فضا اور یک گونہ انفرادیت پیدا ہوئی۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا نے آگے چل کر کالج کے طلبا کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا اور اس کو ایسا دلچسپ بنادیا کہ طلبا بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ مولانا محمد علی مرحوم کہتے تھے کہ میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانے کا ہے''۔(۷)

یہیں مولانا نے طلبا کے اندر سیرت نبویؐ سے عقیدت ومحبت پیدا کرنے کے لیے ایک مختصر رسالہ بدء الاسلام لکھا جو کالج کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ غرض مولانا نے علی گڑھ کے ماحول میں مذہبی رنگ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، خود مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی (مذہبی) زندگی کے پیدا کرنے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی لکھا تھا''۔(۸)

شعروشاعری:

مولانا شبلی نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ علی گڑھ میں شروع میں ان کی شعروشاعری کا بڑا چرچا ہا اور وہ جب تک علی گڑھ میں رہے ہر محفل ومجلس اور تقریب میں ان سے کچھ نہ کچھ ضرور سنا جاتا۔ علی گڑھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں مولانا بڑی دھوم دھام سے اپنا کلام سناتے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی سننے والے سردھنتے، آنسو بہاتے اور قدر جاننے والے ان کی زبان کی فصاحت، معنیٰ کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی مانتے۔(۹)

مولانا اپنا کلام ایک خاص موثر انداز میں سناتے اور بقول سید صاحب'' وہ اپنی نظمیں ایسی دھن میں پڑھتے تھے جس کو سن کر سننے والے اثر میں ڈوب جاتے اور سردھننے لگتے۔ ان کی یہ لے اتنی پھیلی کہ علی گڑھ کالج کے لڑکوں اور قومی جلسوں سے نکل کر اب مشاعرے کی محفلوں تک پہنچ گئی مگر اس وقت یہ بالکل نئی بات تھی''۔(۱۰)

علی گڑھ میں انھوں نے مختلف اصناف سخن مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، مسدس اور نظم وغزل میں طبع آزمائی کی۔ ان کے اردو وفارسی کلام کے دو مجموعے کلیات شبلی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

علی گڑھ سے پہلے علامہ شبلی کی شاعری حسن وعشق پر مشتمل روایتی شاعری تھی مگر علی گڑھ میں مولانا کے موضوع شعر میں تبدیلی آئی اور ان کے ترانے قوم وملت کے غم سے لبریز

ہونے لگے۔ اب مسلمانوں کا عروج وزوال ان کی نظموں کا موضوع ہوگیا۔ علی گڑھ میں مولانا
کی جو چیز سب سے پہلے سامنے آئی وہ ان کے فارسی قصائد تھے۔ اس کے بعد مثنوی صبح امید لکھی
جس میں مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان اور علی گڑھ تحریک کا خوش آئند مرقع پیش
کیا ہے اور علی گڑھ تحریک کو صبح امید سے تعبیر کیا ہے۔ مثنوی بار بار چھپی اور مقبول عام ہوئی۔
مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

> "مولانا کے اردو سرمایے میں سب سے قیمتی ان کی ایک مثنوی مختصر سی کل
> ۲۰ صفحہ کی 'صبح امید' کے نام سے ۱۸۸۴ء یعنی مولانا کے ابتدائی دور کی کہی
> ہوئی بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی ایک چمکیلی مثال، مثنوی کا مضمون نہ فاسقانہ
> ہے نہ عاشقانہ، تمام تر قومی یا ملی ہے لیکن موضوع کی اس سنجیدگی کے
> باوجود ایسی بانکی، ایسی سجیلی، ایسی البیلی کہ گلزار نسیم اور ترانہ شوق کی ہم
> نوا سرسید اور ان کی تحریک اصلاح پر ہے۔" (۱۱)

اردو شاعری کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس میں سرسید احمد خاں کا جیسا پاکیزہ کردار
شبلی نے اشاروں اشاروں میں کھینچ دیا ہے، وہ حالی کی حیات جاوید سے بھی نہ ہوسکا۔ (۱۲)
یہ مثنوی پنڈت دیا شنکر نسیم کی مشہور مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں ہے۔ اس مثنوی کا تتبع
مولانا شبلی کے زمانے میں عام تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کے لب ولہجے اور طرز ادا میں
مثنویاں لکھیں مولانا شبلی بھی اس کے بڑے قدرداں تھے اور اسی انداز پر یہ مثنوی لکھی، لیکن ان
دونوں مثنویوں میں بڑا فرق ہے۔ گلزار نسیم حسن وعشق کی جھوٹی داستان ہے، مگر صبح امید اس کے
برعکس حقیقت وواقعیت کی صحیح مرقع آرائی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ قوم کہ جان تھی جہان کی — جو تاج تھی فرق آسمان کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کردیئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزہ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر

روما کے دھوئیں اڑا دئے تھے   اٹلی کو کنوئیں جھنکا دیئے تھے

معقول کو فقہ کو ادب کو   ہم ہاتھ سے کھو چکے ہیں سب کو
بیہودہ فسانہائے پاریں   زلف و خط و خال کے مضامین
وہ نوک و مژہ کی نیزہ بازی   وہ ترک نگہ کی فتنہ سازی
یہ طرز یہ خیال تھا ہمارا   یہ فن یہ کمال تھا ہمارا
جغرافیہ وجود سارا   ہر چند کہ ہم نے چھان مارا
کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی   لیکن نہ خبر ملی کمر کی
نالوں کو دکھائے جب تماشے   گردوں کے اڑا دیئے پرخچے
دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں   آیا نظر ایک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی   چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی   چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم   توقیر کی صورت مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا   وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اُٹھتے ہوئے جوش سے بہ رقت   ہے مرثیہ خوان قوم و ملت

علی گڑھ کے قیام کے زمانے کی ایک مشہور مسدس بھی مولانا کی اردو شاعری کا کارنامہ ہے۔ یہ مسدس جب انھوں نے علی گڑھ کی سالانہ نمائش ۱۸۹۴ء میں تماشائے عبرت کے نام سے پڑھی تو ایک سماں بندھ گیا۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے   یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے   دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیوں کر

مرد و شیراز و صفاہاں کے وہ زیبا منظر   بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار و در

مصر و غرناطہ و بغداد کا اک اک پتھر   اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک

داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر اب تک

مولانا شبلی نے اصلاً فارسی میں شاعری کی اور ان کا فارسی کلام غالب کی فارسی شاعری کا ہم پلہ ہے مگر اردو کلام میں فارسی غزلوں کا سا جوش اور سرور و سرمستی نہیں لیکن مولانا کی اردو میں تاریخی اور اخلاقی نظمیں اپنی مثال آپ ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں:

''تاریخی اور اخلاقی نظموں کے لکھنے میں تو کوئی ان کی ہمسری نہیں کرسکا۔ ہجرت نبویؐ، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، اور رسول اللہ کا حلم اور عفو، اہل بیت رسولؐ کی زندگی، ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر، مساوات اسلام خلافت فاروقی کا ایک واقعہ، عدلِ فاروقی کا ایک نمونہ، جرأت و صداقت اور اسلام کے تنزل کا اصلی سبب وغیرہ کے عنوانات سے جو تاریخی اور اخلاقی نظمیں لکھ دی ہیں، وہ اردو شاعری کا راس المال ہیں''۔ (۱۳)

تصنیف و تالیف:

مولانا شبلی کو تصنیف و تالیف کا ذوق ابتدائے عمر سے تھا مگر علی گڑھ کی فضا اور سرسید کی صحبت نے ان کے اس ذوق میں بھی انفرادیت پیدا کردی اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعے کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یورپ کی چیرہ دستی کا جو اثر مسلمانوں پر پڑ رہا تھا، مولانا اس سے اچھی طرح علی گڑھ میں ہی واقف ہوئے۔ یورپ کے اہل قلم تاریخ اسلام، علوم اسلامیہ اور مسلم سلاطین کے زریں کارناموں کو داغ دار کرنے اور مٹانے کے لیے طرح طرح کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں سے کام لے رہے تھے۔ ان کا یہ مقصد تھا کہ ''مسلمانوں کی نئی پود کو خود اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ ان کے دماغی قویٰ ہمیشہ

کے لیے مضمحل ہو جائیں"۔اس تدبیر کو جس نے سب سے پہلے سمجھا اور اس کے مقابلے اور تردید کے لیے علماء کی صف سے جو شخص سب سے پہلے میدان میں آیا وہ مولانا شبلی ہی تھے۔ انھوں نے اپنے علمی، تاریخی اور تحقیقی مضامین وکتب سے ان کی ایسی تردید کی کہ ان کی آوازیں صدا بہ صحرا ہو گئیں۔

۱۔مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم:

یہ تصنیف دراصل مولانا شبلی کا ایک گراں قدر خطبہ ہے جو ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں دیا گیا تھا، اسے مولانا نے سرسید کی فرمائش پر لکھا تھا۔اس میں مولانا نے طریقۂ تعلیم، اسلامی مدرسوں کے نام، حالات وخصوصیات بیان کیے ہیں۔یہ خطبہ کتابی صورت میں بار بار چھپا اور ملک میں مقبول ہوا، مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:۔

> "مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی، سارے ملک میں اس خطبے کی دھوم مچ گئی"۔(۱۴)

۲۔المامون:

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم کے بعد مولانا کی دوسری تصنیف المامون شائع ہوئی جو مولانا شبلی کے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام کی پہلی کڑی ہے۔یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی اور صرف تین مہینے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا، اس کتاب میں مولانا نے خلیفہ مامون الرشید کے حالات وسوانح اور اس کے علمی وعملی کارناموں کو تفصیل سے لکھا ہے۔نیز اس میں مامون کی حکومت کے نظم ونسق، فتوحات اور اس کے زمانے کے ارباب فضل وکمال کا بھی ذکر کیا ہے۔اس کی تعریف کرتے ہوئے سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

> "ہمارے لائق مصنف نے اس کا (تاریخ کا) بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔جو خوب صورت ہے خوب صورت ہے جو بھونڈی ہے بھونڈی، نہ

خوب صورتی کو زیادہ خوب صورت بنایا ہے اور نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے"۔(۱۵)

المامون کی زبان کے بارے میں سرسید نے لکھا کہ ایسی صاف شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔(۱۶)

۳۔سیرۃ النعمان:

علامہ شبلی کو امام ابوحنیفہؒ سے بڑی عقیدت ومحبت تھی انہی کی نسبت سے خود کو نعمانی لکھتے تھے ایک مرتبہ بعض وجوہات کی بنا پر نام بدل کر نعمانی کی جگہ الاعظمی لکھا تب بھی امام اعظم ابوحنیفہ ہی کی طرف نسبت کی، یہ کتاب اسی عقیدت واحترام کا نتیجہ ہے۔جس میں انھوں نے امام ابوحنیفہ کی سوانح حیات، ان کی فقہ کی خصوصیات اور ان کے شاگردوں کے حالات وواقعات لکھے ہیں۔یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔

یہ دونوں کتابیں سرسید نے کالج کی طرف سے شائع کیں، اس سے کالج کو بڑا فائدہ پہنچا، سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

> "مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حق تصنیف وغیرہ کالج کی نذر کردی ہیں۔ان کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا اور آئندہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدے کے لئے لکھتے ہیں اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں، ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے المامون کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے۔میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے لے لو، ہرگز نہ مانے مجھ سے خریدکیں اور اپنے دوستوں کو بھیج دیں۔(۱۷)

۴۔سفرنامہ روم ومصروشام:

یہ مولانا کا وہ سفرنامہ ہے جو انھوں نے ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس اور قاہرہ کے سفر سے واپسی کے بعد لکھا تھا۔۱۸۹۴ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا اور

نہایت مقبول ہوا۔

اس سفرنامے میں سفر کے حالات وواقعات اور جن مقامات کا سفر کیا اور جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اس کو مولانا نے تفصیل سے لکھا ہے اور ان ممالک کے معاشرتی اور تمدنی حالات اور علمی و تعلیمی صورت حال پر مولانا نے بڑے اچھے انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ یہ سفرنامہ بھی علی گڑھ میں لکھا گیا۔

۵۔ مجموعہ نظم شبلی :

سفرنامہ کے بعد مولانا نے اپنی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ نظم شبلی کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا اسے منشی رحمت اللہ صاحب رعد نے اپنے مطبع نامی پریس میں چھاپا۔

۶۔ رسائل شبلی:

یہ مولانا کے ان مختلف محققانہ اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں لکھے تھے، اسے خود مولانا نے مرتب کر کے دیباچہ لکھا اور شائع کیا۔ اس میں زیادہ تر مضامین مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت سے متعلق ہیں جیسا کہ اس کی درج ذیل فہرست سے ظاہر ہے۔

اسلامی حکومتیں اور شفاخانے، اسلامی کتب خانے، حقوق الذمیین الجزیہ، میکنکس اور مسلمان، ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس کا خطبہ، النظر فی السفر الی المؤتمر، کتب خانہ اسکندریہ، تراجم، اسلامی مدارس، قدیم تعلیم۔ وغیرہ۔

مستشرقین کا الزام ہے کہ مسلمانوں نے فتح مصر کے بعد کتب خانہ اسکندریہ کو برباد کر دیا تھا۔ ان کا یہ الزام اس دیدہ دلیری سے دہرایا جاتا رہا کہ اکثر مسلمان بھی اسے صحیح باور کرنے لگے تھے۔ مولانا نے اس کی تردید کی اور لکھا کہ فتح مصر سے بہت پہلے یہ کتب خانہ برباد ہو چکا تھا اور مسلمانوں پر اس کا الزام بے بنیاد اور غلط ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ یہ "مضمون اتنا جامع اور مدلل تھا کہ مخالفین تک کو بھی اس کے ماننے سے چارہ نہ رہا اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا۔ (۱۸) یہ مضمون بھی رسائل شبلی میں شامل ہے۔

اسی طرح مسلمان بادشاہوں پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر جزیہ جیسا ظالمانہ ٹیکس لگا کران کی بڑی توہین کی۔ اس الزام کے جواب کے لیے بھی مولانا ہی نے قلم اُٹھایا اور الجزیہ لکھ کر جزیہ کی حقیقت واضح کردی اس مضمون کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہوا۔ یہ مضمون بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

رسائل شبلی اسی طرح کے تحقیقی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ سب مضامین علی گڑھ کالج ہی میں بیٹھ کر لکھے گئے۔

۷۔الفاروق:

''الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا تھا''۔ مولانا شبلی کی سب سے جامع اور محققانہ کتاب ہے، مولانا کے زمانۂ علی گڑھ کے تمام کارناموں میں یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے اس کے لکھنے کا ارادہ مولانا نے المامون کے بعد ہی کیا تھا اور اس کا کچھ حصہ لکھ بھی لیا تھا مگر اس کے لیے جن نادر کتابوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان کے کتب خانوں میں مفقود تھیں اور یورپ میں طبع ہو رہی تھیں۔ اس لیے کام روک دینا پڑا۔ پھر ۱۸۹۴ء میں مولانا نے الفاروق لکھنے کا عزم مصمم کرلیا۔ وہ نادر کتابیں جو ہندوستان میں نہ تھیں اور یورپ میں طبع ہو رہی تھیں، اب کچھ چھپ کر آ گئی تھیں۔ مولانا قسطنطنیہ کے سفر میں بھی الفاروق سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے اور ان سے ضروری اقتباسات بھی نقل کرلائے تھے۔ غرض الفاروق لکھنے میں اب کوئی چیز مانع نہ رہ گئی تھی۔ مولانا نے کام شروع کیا اور ۱۸۹۸ء میں چار سال کی مسلسل محنت کے بعد الفاروق وجود میں آئی اور جن لوگوں کو فاروق اعظم کے کوکبہ جلال کا انتظار تھا، انھوں نے اس جلوہ کو دیکھا۔ الفاروق خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی سوانح عمری ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں حضرت عمر کے نام ونسب اور ولادت سے وفات تک کے حالات اور ان کی فتوحات کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے تمام ملکی، مالی اور فوجی انتظامات کے علاوہ ان کے فضل وکمال اور مجتہدانہ کارناموں کا مفصل تذکرہ ہے۔

الفاروق کی زبان اور اسلوب اس قدر شاندار ہے کہ اسے سوانحی ادب کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

مولانا شبلی نے اپنے علمی، ادبی، تاریخی اور تعلیمی کارناموں کی وجہ سے علی گڑھ میں بڑی شہرت و مقبولیت پائی اور کالج کو بھی نیک نام کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا کے پے در پے محققانہ مضامین، تعلیمی کانفرنس کے خطبے اور عالمانہ تصانیف نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کالج کا نام روشن کرنے میں بڑی مدد کی۔ اس زمانے میں کالج ہر قسم کی ادبی تحریکات کا مرکز تھا۔ یہیں سے نئی کتابیں نکلتی تھیں اور نئے محققانہ مضامین کی اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان سے نکل کر روم، شام، مصر مولانا جہاں گئے، علی گڑھ کالج کی شہرت کے دائرے کو بڑھاتے چلے گئے۔"(۱۹)

مولانا شبلی نے اپنی زندگی کے ۱۶ سال (۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۸ء تک) علی گڑھ سے وابستگی میں گزارے اور کالج کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے علم و فضل اور گوناگوں کمالات اور ہر ممکن ذریعہ و کوشش سے علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔

حوالے:

(۱) علی گڑھ گزٹ، جلد ۱۶، شمارہ ۸۲، ص ۱۱۷۵۔ مورخہ ۱۵ / اکتوبر ۱۸۸۱ء

(۲) حیات شبلی ص ۱۱۸ ۔ ۱۲۰، معارف پریس، اعظم گڑھ طبع چہارم ۱۹۸۳ء

(۳) مکاتیب شبلی، جلد ۱، ص ۵۶، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۶۶ء

(۴) بحوالہ حیات شبلی، ص ۱۲۷

(۵) ایضاً۔ ص ۱۵۹

(۶) ایضاً۔ ص ۱۵۲

(۷) ایضاً۔ ص ۱۴۹

(۸) مکاتیب شبلی جلد ا ص ۷ ۴

(۹) کلیات شبلی اردو، ص ا، معارف پریس، اعظم گڑھ طبع ششم، ۱۹۸۷ء

(۱۰) ایضاً۔ ص ۱۰

(۱۱) مولانا عبدالماجد دریابادی، انشائے ماجدی، ص ۲۸۹۔۲۹۰، ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۱۹۹۱ء

(۱۲) بحوالہ شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، ص ۵۷، مکتبہ اردو۔ لکھنؤ

(۱۳) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر۔ ص ۱۳۷۔۱۳۸، معارف پریس، اعظم گڑھ طبع اول، ۱۹۸۵ء

(۱۴) حیات شبلی۔ ص ۱۷۱۔

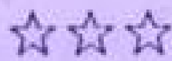
(۱۵) دیباچہ المامون ص ۳۔۴، ناشر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء

(۱۶) ایضاً۔ دیباچہ ص ۳

(۱۷) خطوط سرسید۔ ص ۱۳۸

(۱۸) حیات شبلی۔ ص ۲۲۶

(۱۹) ایضاً ص ۱۵۸



باقیات شبلی - ایک مطالعہ

مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے استاذ علامہ شبلی کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا، سیرۃ النبی کی دونوں جلدیں، شعر العجم کا آخری حصہ اور مقالات و خطبات اور مکاتیب کی گیارہ جلدیں انہیں کی محنت جمع و تدوین سے وجود میں آئیں، بہت سی تحریریں جو بعد میں ان کے دست رس میں آئیں انہیں بڑے اہتمام سے معارف میں شائع کیا تاہم اس کے باوجود بہت سے علم کے موتی ان کے ہاتھ نہ آسکے، انھیں کو جناب مشتاق حسین صاحب اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نے باقیات شبلی میں سلیقے سے یکجا کیا ہے، اسے آزاد کتاب گھر دہلی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔

باقیات شبلی میں چھ مضامین، تین خطبے اور ۶۷ خطوط شامل ہیں، یہ خطوط مندرجہ ذیل اشخاص کے نام ہیں:

[۱] ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ [۲] سر سید احمد خاں [۳] نواب اقبال یار جنگ [۴] مولانا محمد علی مونگیری [۵] مفتی شیر علی [۶] ہمایوں مرزا [۷] عزیز صفی پوری [۸] مولوی بشیر الدین اٹاوہ [۹] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۰] نواب محسن الملک [۱۱] مولوی عبدالحق [۱۲] سید ابن مرتضی بلگرامی [۱۳] نواب سید علی حسن خاں [۱۴] اعزہ و احباب [۱۵] نواب وقار الملک [۱۶] مولانا حمید الدین فراہی [۱۷] ڈاکٹر سید محمود [۱۸] مرزا سلیم [۱۹] ایڈیٹر اودھ اخبار [۲۰] حامد نعمانی [۲۱] ضیاء الدین برقی [۲۲] طیبہ بیگم بلگرامی۔

ان خطوط کے علاوہ اپریل، مئی، جون، جولائی، دسمبر ۱۹۰۳ء کی انجمن ترقی اردو کی

روداد بھی اس میں شامل ہے، انجمن ترقی اردو جس کے علامہ شبلی پہلے سکریٹری تھے، اس کا ایک اعلامیہ بھی نقل کیا گیا ہے، خدابخش پٹنہ اور کتب خانہ رام پور کے متعلق علامہ شبلی نے جو رپورٹ تیار کی تھی اسے بھی اس میں جگہ دی گئی ہے، علامہ کے روزنامچہ کے چند اوراق بھی اس مجموعہ کی زینت ہیں، وہ نایاب تحریر بھی شامل اشاعت ہے جو کسی "شریر" نے ش ن کے فرضی نام سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کرائی تھی تاکہ علامہ شبلی کو بدنام کیا جا سکے، اس کے جواب میں علامہ نے جو مراسلہ لکھا تھا اسے بھی مرتب نے نقل کیا ہے، غرض باقیات شبلی، علامہ شبلی کی بوقلموں شخصیت کا نمونہ اور ان کے فکر و خیال کے جلووں کی ایک اور تماشا گاہ ہے۔

اس مجموعہ کا پہلا مضمون علمائے اسلام ہے جو ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا، اسی سنہ میں علامہ شبلی علی گڑھ سے وابستہ ہوئے اس لئے یہ ان کے بالکل ابتدائی دور کا مضمون ہے، اس میں انھوں نے قوم کی زبوں حالی اور پستی کے ذکر کے ساتھ علماء کی بے خبری اور بے فکری پر آنسو بہائے ہیں، ان کے فرائض یاد دلائے ہیں اور قوم کی عزت و سربلندی کے کام کا مشورہ دیا ہے، جدید تعلیم کی اہمیت اور قدیم تعلیم کے نقائص واضح کئے ہیں اور آخر میں بڑے پرسوز انداز میں لکھا ہے کہ:

> "اے میرے پاک خدا! اگر ہم لوگوں کی ذلت میں کوئی مرحلہ باقی رہ گیا ہو تو ہم نہیں چاہتے کہ وہ ناطے شدہ رہ جائے مگر اس امید پر کہ جو کچھ ہونا ہے جلد ہولے۔ مرنے کو ہم آمادہ ہیں مگر پھر زندہ ہونے کی امید پر، اجڑ جانے کے لئے ہم تیار ہیں مگر نئے سرے سے آباد ہونے کے خیال میں۔(۱)

علامہ شبلی کی مثنوی صبح امید جن لوگوں کی نظر سے گذری ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ وہی تمام باتیں اور خیالات اس مضمون میں ہیں، پورے مضمون میں سرسید علیہ الرحمہ کا اسلوب و انداز اور فکر و خیال قائم ہے۔

دوسرے مضمون کا عنوان ہے "وہ غلطی زیادہ خطرناک ہے جو انسان کو اپنی نسبت آپ ہو"۔ اس میں بھی قوم کی حالت کا ماتم ہے، ذلت و نکبت سے ابھرنے کے لئے طرح طرح

سے قوم کو آمادہ کرنے کی کوشش ہے، قوم کو حالات کا رخ پہچاننے اور ترقی سے آنکھیں نہ بند کرنے کا مشورہ ہے۔

وقف علی الاولاد سے متعلق ایک یادداشت اور ندوہ کے درجہ تکمیل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، ایک قدرے مفصل مضمون میں ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں کیا ہوگا اور کیا ہونا چاہئے اس میں بھی انھوں نے نصاب ندوہ اور جدید قومی ضروریات کا ذکر کیا ہے، حفاظت نومسلمین وانسداد ارتداد، تصحیح کتب انگریزی، سیرت نبویؐ، لغات جدیدہ، کتب خانہ، وغیرہ موضوعات پر اظہار خیال ہے، کئی لحاظ سے یہ مضمون بڑا اہم ہے، مثلاً اس میں پہلی بار سیرۃ النبیؐ کا ذکر ہے، کتب خانہ کی ضرورت کا ذکر ہے، تاریخ کی تصحیح کا ذکر ہے، مدارس عربیہ کی رپورٹ کے بارے میں پہلی بار علامہ نے قوم سے گذارش کی ہے کہ وہ مدارس کا جائزہ لیں اور اس میں یہ تمام تفصیلات ہوں کہ مدرسہ کہاں واقع ہے، مدرسے کا نام کیا ہے، سنہ قیام، مہتمم، مدرسین کے نام اور ان کی شرح تنخواہ، طلبہ کی تعداد اور آمد وخرچ، یہ تمام تفصیلات تیار کر کے ندوہ بھیجی جائیں گویا وہ ندوہ کو مدارس کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ (۲)

اس کا آخری مضمون عورت اور اسلام ہے اس میں انھوں نے دکھلایا ہے کہ اسلام میں عورت کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے اور متعدد دلائل سے عورتوں کے حقوق کی نشاندہی کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عورت دراصل عزت کا ایک نام ہے۔

ان مضامین کے علاوہ علامہ شبلی کے تین خطبات اس مجموعہ میں شامل ہیں جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں دیئے گئے تھے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوئے تھے، ان خطبات کا بنیادی موضوع تعلیم ہے، پہلے دونوں خطبوں میں جدید تعلیم کی اہمیت وافادیت واضح کی ہے، قوم کی پستی پر علامہ شبلی نے آنسو بہائے ہیں اور قعر مذلت سے نکلنے کی تدبیروں کو بیان کیا ہے ان کا خیال ہے کہ ترقی کے تمام ذرائع سے قوم دانستہ طور پر بے اعتنائی برت رہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسے مستقبل کے خطرات سے واقف کرایا جائے چنانچہ انھوں نے جدید تعلیم میں قوم کی ترقی کا راز مضمر بتایا ہے، یہ خطبے دراصل وہ مباحث ہیں جو علامہ نے کانفرنس کے متعدد

ریزلوشن پر بحث کرتے ہوئے دیئے تھے، اس لئے اس میں مذکورہ بالا خیالات کے ساتھ حکومت کی تعلیمی پالیسیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس سلسلے کے آخری خطبے میں فارسی زبان کی اہمیت اور اس کے فوائد کا ذکر ہے، بعض دوسری زبانوں کے مقابلہ میں فارسی کی فوقیت بھی دکھلائی ہے، یہ دراصل الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی کے خارج کرنے پر بحث ہے، اس میں انھوں نے مخالفین فارسی کے دلائل کی کمزوری بھی واضح کی ہے۔

علامہ شبلی کو کتب خانوں سے بے انتہا دلچسپی تھی، انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیکڑوں کتب خانوں سے استفادہ کیا جس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا، ہندوستان کے کتب خانوں میں خدا بخش پٹنہ اور کتب خانہ رام پور سے انھیں خاص لگاؤ تھا، ان کے متعلق ان کے ذمہ داروں کی خواہش پر علامہ شبلی نے جو رپورٹ لکھی جس میں کتب خانوں کے نظم و ترتیب کی وضاحت کی ہے، باقیات شبلی میں انھیں بھی شامل کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی کے روزنامچہ کے محض چند اوراق اس میں شامل ہیں جو مرتب کو ہاتھ آگئے تھے، اس سے ان کی نجی زندگی کے متعدد واقعات کا پتہ چلتا ہے، اسفار، پیسے کے لین دین اور ندوہ کے حساب و کتاب پر بھی ان سے روشنی پڑتی ہے، کاش یہ روزنامچہ محفوظ رہا ہوتا تو مخالفین شبلی کو اندازہ ہوتا کہ وہ کس قدر دیانت دار اور پاک طینت شخصیت کے مالک تھے۔

علامہ شبلی ۱۹۰۲ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری منتخب ہوئے اور انتہائی سرگرمی کے ساتھ اس کے کاموں کا آغاز کیا، طبع و اشاعت کتب کے متعدد منصوبے بنائے، اہل علم کو خطوط لکھے یہ تمام تفصیلات انجمن کی روداد میں محفوظ ہیں، علامہ شبلی جب تک سکریٹری رہے ماہ بہ ماہ اس کی روداد لکھتے، باقیات شبلی میں کئی ماہ کی رپورٹیں شامل ہیں جو بہر حال انجمن کی ابتدائی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہیں۔

اس طرح باقیات شبلی میں متنوع موضوعات ہیں ان کا مطالعہ کئے بغیر علامہ کی شخصیت مکمل طور سے سامنے نہیں آسکتی۔

باقیات شبلی ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی اس کے بعد بھی علامہ شبلی کی بعض تحریریں دریافت ہو کر شائع ہوئیں، ان تمام تحریروں کو مولانا سید سلیمان ندوی کے مرتب کردہ مقالات وخطبات اور مکاتیب میں شامل کرنا اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ یکجا ہو جائیں اور مطالعہ شبلی میں ان سے بھرپور استفادہ کیا جا سکے۔

باقیات شبلی میں شامل تمام تحریریں غالباً مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر سے نہیں گذریں ورنہ وہ ان کے مرتبات میں شامل ہوتیں، یقیناً ان کی شمولیت سے سید صاحب کے مقاصد کی بھی تکمیل ہوگی۔

حوالے

(۱) باقیات شبلی ص ۶۳

(۲) ایضاً ص ۱۲۱-۱۲۲



حیات شبلی - ایک مطالعہ

حیات شبلی عہد جدید کے معلم اول، سیرت نگار رسول اعظم، اور بانی دارالمصنفین علامہ شبلیؔ کی سوانح عمری ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں ''پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے ۳۲ برس (۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا۔'' (۱)

علامہ شبلی کی سوانح عمری ان کی زندگی ہی میں حیات النذیر کے مصنف افتخار عالم مارہروی نے لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ شبلی کو متعدد خطوط بھی لکھے تھے مگر علامہ شبلی یہ کہہ کر ٹال گئے کہ ''میری لائف میرے بعد لکھیے گا، ورنہ مکمل لائف کیونکر ہوگی'' (۲) لیکن مارہروی صاحب نے دوبارہ سید صاحب کے ذریعہ یہ سفارش کرائی کہ علامہ شبلی اپنی سوانح عمری لکھنے کی اجازت دے دیں مگر علامہ نے اس کے جواب میں فروری ۱۹۱۴ء میں سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھا کہ

> ''افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا'' (۳)

دراصل علامہ شبلی کی یہ خواہش تھی کہ ان کی سوانح حیات سید صاحب ہی لکھیں کہ واقعی اس کے اہل اور اصل مستحق سید صاحب ہی تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے محبوب استاذ کے انتقال کے ۲۶ رسال بعد ۱۹۴۰ء میں اس فرض وقرض کی ادائیگی کا آغاز کیا اور تین سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۹۴۲ء میں اسے مکمل کیا۔ ۱۹۴۳ء میں یہ دارالمصنفین سے شائع ہوئی، یہاں یہ لائق ذکر ہے کہ علامہ شبلی کی خواہش کے عین مطابق سید صاحب نے دوسرے تمام تصنیفی امور

سے فارغ ہو کر یہ کتاب قلم بند کی اور یہی ان کی آخری تصنیف ثابت ہوئی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بعد میں اس کی ضخامت کے پیش نظر دبستان شبلی کے ایک نامور ادیب وانشاپرداز پروفیسر عبدالرزاق قریشی نے اس کی تلخیص کی جو مختصر حیات شبلی کے نام سے عثمانیہ بک ڈپو بمبئی سے شائع ہوئی۔

علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر جو علمی وتحقیقی کتابیں اور مضامین لکھے گئے حقیقت یہ ہے کہ ان سب کا مرجع وماخذ حیات شبلی ہی ہے، ۸۵۰ صفحات پر مشتمل اس ضخیم سوانح عمری میں علامہ شبلی کے احوال بلکہ ان کے معاصر عہد کے واقعات کو بتمام وکمال جمع کر دیا گیا ہے، شروع میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالی ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اشخاص وافراد پیدا کرتا ہے اور جس طرح مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا کرامت علی جونپوری، مولوی چراغ علی، اور سر سید احمد خاں نے اپنے عہد کے فتنوں کا مقابلہ، اسلام کا دفاع اور اس کی سربلندی کے لئے جدوجہد کی، اسی طرح علامہ شبلی کو بھی اللہ تعالی نے وقت اور زمانہ کے مطابق پیدا کیا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم وتاریخ وتمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے۔" (۴)

دیباچہ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلہ کے لئے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنھوں نے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے

فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم وتمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیوں کر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈال دی'' (۵)

ابتدائی دیباچوں کے بعد ۵۲ صفحات پر مشتمل ایک گراں قدر مقدمہ ہے۔ جس کا معنی خیز آغاز علامہ شبلی کی اس مشہور عبارت سے کیا ہے کہ ''اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی''۔ اس مقدمہ میں اسلامی ہند کے مسلمانوں کی پوری علمی دینی اور قومی وملی جدوجہد کی طویل داستان کی اجمالی تاریخ آ گئی ہے، خاص طور سے دیار پورب اور خطہ اعظم گڑھ کی علمی ادبی، ثقافتی اور دینی تاریخ اس طرح پیش کی گئی ہے کہ یہ اپنے موضوع پر اولین کاوش ہونے کے باوجود اب تک حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے، بجا طور پر مقدمہ بذات خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، ڈاکٹر عبدالقیوم اور پروفیسر آل احمد سرور نے البتہ یہ تنقید کی ہے کہ اس طویل مقدمہ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ (۶) ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی اپنے تحقیقی مقالے میں اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا رایوں سے اس لئے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ حیات شبلی کے اس مبسوط مقدمہ کی وجہ سے اس کتاب میں جو وزن اور وقار پیدا ہوا وہ اردو کی کسی اور سوانح عمری میں نہیں پایا جاتا، اس مقدمہ سے خطۂ پورب کی جو روشن تصویر سامنے آتی ہے اور معلومات کا جو چشمہ شیریں ابلتا ہے وہ اس کی طوالت کا احساس ہی نہیں ہونے دیتا۔'' (۷)

ابتدائی ابواب میں اعظم گڑھ اور اس کے قدیم قصبات چریا کوٹ، ماہل، مبارک پور، محمد آباد، گھوسی، سگڑی وغیرہ کی مختصر تاریخ اور علامہ شبلی کے حسب ونسب، خاندان، ولادت ووطن، تعلیم وتربیت، ابتدائی مشاغل، تصانیف، شعر وشاعری، وکالت اور بعض ذاتی حالات قلم بند کئے گئے ہیں، نیز علی گڑھ سے وابستگی وہاں قیام اور اس دور کی علمی، ادبی اور تصنیفی خدمات کا

مفصل ذکر ہے پھر دو ابواب میں ان کی تصانیف کا تعارف علی گڑھ کالج کی ترقی میں ان کا حصہ اور پھر علاحدگی اور اس کے اسباب بیان کئے گئے ہیں، حیدر آباد سے وابستگی اور اس دور کے علمی وادبی کاموں، تصانیف اور ان کی دیگر مصروفیات کا بھی مکمل ذکر کیا گیا ہے، پھر ایک نسبتاً طویل باب میں تحریک ندوۃ العلماء کی تاریخ ہے، اس میں علامہ شبلی کی تحریک ندوہ سے دلچسپی، ندوہ کی معتمدی اور اس کی ترقی میں ان کی جدوجہد اور دوسرے علمی مشاغل کا ذکر ہے، ایک مختصر باب میں ماہنامہ الندوہ کا اجراء، مقاصد اور اہمیت وغیرہ بیان کی گئی ہے بعد ازاں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعمیر و ترقی میں علامہ شبلی کی اہم مساعی کا بیان ہے، علامہ شبلی کے پیر کے حادثہ کی پوری روداد اور اس سلسلہ میں شعراء کے مراثی وغیرہ بھی نقل کر دئے ہیں۔ ایک باب میں علامہ شبلی کی سیاسیات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے، ندوہ میں علامہ شبلی کی مخالفت کا بھی مفصل جائزہ لیا گیا ہے، علامہ شبلی کے بھائی مولوی محمد اسحاق (وکیل ہائی کورٹ) کی وفات کا سانحہ پیش آیا اس کی پر اثر داستان بھی ہے جس میں علامہ شبلی کا مشہور مرثیہ اسحاق بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ اعظم گڑھ میں شبلی اسکول (جواب پوسٹ گریجویٹ کالج بن چکا ہے) کی ابتداء اور عہد بعہد کی ترقیوں کی تفصیل اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی مختصر تاریخ اور اس سے علامہ شبلی کی دلچسپیوں کا بھی الگ الگ ذکر ہے، دارالمصنفین کے ابتدائے تخیل سے وجود میں آنے تک کی تاریخ بھی ہے، اس میں سیرت نبوی کے عظیم الشان منصوبہ کی بھی تاریخ آ گئی ہے جو علامہ شبلی کے انتقال کے عرصہ پر محیط ہے، آخر میں علامہ شبلی کی وفات، اولاد اور اخلاق و عادات کو بھی بیان کیا گیا ہے اور ان کی وفات پر لکھے جانے والے اہم مراثی و قطعات کو بطور ضمیمہ پیش کیا گیا ہے، اس طرح اس ضخیم کتاب میں علامہ شبلی کی زندگی کے تمام حالات و واقعات اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے اسلامی ہند کی علمی و عملی جدوجہد کی پوری تاریخ اس میں سمٹ آئی ہے، خود سید صاحب رقم طراز ہیں:

> "یہ نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی،

مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں بہت سے اشخاص
کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کے سمجھنے کے
لئے جاننا ضروری تھا شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں دیار مشرق
میں علوم اسلامیہ کی تعلیم واشاعت کی تاریخ ہے جو بڑی دیدہ ریزی سے
یکجا ہوئی ہے۔" (۸)

حیات شبلی علی العموم پسند کی گئی لیکن چونکہ اس میں علامہ شبلی اور سرسید احمد خاں کے اختلافات کے ضمن میں علامہ شبلی کو حق بجانب ٹھہرایا گیا تھا اس لئے سرسید کے بعض عقیدت مندوں کو اس سے ٹھیس پہنچی اور انھوں نے عقیدت کے جوش وغلو میں حیات شبلی پر سخت ردعمل کا اظہار کیا، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اسے نذرانہ عقیدت بتایا(۹) آل احمد سرور نے اسے سرکاری سوانح عمری قرار دیا (۱۰) اور چونکہ علامہ شبلی نے سرسید کی سوانح عمری حیات جاوید کو کتاب المناقب اور مدلل مداحی قرار دیا تھا (۱۱) اس لئے محمد ابراہیم ڈار نے حیات شبلی پر طویل تبصرہ کرتے ہوئے اسے بھی جواباً کتاب المناقب اور مدلل مداحی قرار دیا (۱۲) شیخ اکرام نے حیات شبلی پر تیز وتند تنقید کی اور اپنی دانست میں اس کتاب میں کمیوں اور خامیوں کا ڈھیر لگا دیا (۱۳) لیکن غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے حیات شبلی سرکاری سوانح عمری، نذرانۂ عقیدت اور کتاب المناقب اور مدلل مداحی جیسے طنز وتعریض والے خطابات کے برعکس مشرقی سوانح عمری کی بہترین مثال ہے اور جس تاریخی سوانح عمری لکھنے کی ابتداء علامہ شبلی نے کی تھی سیرت عائشہؓ اور پھر حیات شبلی اس علمی روایت کی کڑیاں ہیں جس کی افادیت کا انکار سطحی اعتراضات سے نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ محمد اکرام نے بالآخر اس کا اعتراف یہ لکھ کر کیا ہے کہ یہ ہماری زبان کی سب سے مفصل اور وقیع سوانح عمری ہے، مزید یہ کہ "سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو حیات جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا۔" (۱۴)

علامہ شبلی اور سرسید کے اختلافات سے چشم پوشی کرنا یقیناً ایک بددیانتی ہوتی لیکن سید صاحب نے چشم پوشی نہیں کی بلکہ انھوں نے اس اختلاف اور اس کے اسباب کو وضاحت

وتفصیل سے بیان کیا یہ اور بات ہے کہ اس موازنہ میں انھوں نے شبلی کو حق بجانب ٹھہرایا اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی منصف مزاج شخص اس بحث کو پڑھے گا تو شبلی کو حق بجانب ہی ٹھہرائے گا، مگر سرسید کے مذکورہ عقیدت مندوں نے اس بحث سے شبلی کو سرسید کا مدمقابل سمجھ لیا(۱۵) حالانکہ بقول آل احمد سرور شبلی کی تحریک کا مقصد سرسید کی تحریک کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ اس کی اصلاح کرنا تھا(۱۶)

مذکورہ عقیدت مندوں نے علامہ شبلی کے بارے میں ردعمل کے طور پر متعدد غلط فہمیاں پھیلائیں، مولوی عبدالحق کا مقدمہ خطوط شبلی، امین زبیری کا تبصرہ ذکر شبلی اور عبدالوحید قریشی کی کتاب شبلی کی حیات معاشقہ اسی کے ردعمل اور معاندانہ طرزعمل کا نتیجہ ہیں جو اصلاً ان کی کج نیتی کی وجہ سے وجود میں آئیں، حالانکہ خود سید صاحب نے بھی حیات شبلی کے دیباچہ میں یہ اعتراف کیا تھا کہ:

> ''خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمری کے صحیح اصولوں پر پوری منطبق ہے تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہوا اس کو بے کم وکاست سپرد قلم کردیا جائے، مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو داہ کے کانٹوں سے بچا کر نکالا جائے تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں اس لئے کوئی سوانح نگار اپنی معصومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہوسکتی ہیں کیونکہ محبت وعقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار واعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیات فطرت

کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد اور منقد دونوں معذور ہیں بہر حال شبلی شبلی تھے جنید و شبلی نہ تھے۔" (۱۷)

راقم کے خیال میں اس وضاحت کے بعد اس مصنوعی غیض وغضب کی کوئی ضرورت نہ تھی جو حیات شبلی پر ظاہر کیا گیا، محمد ابراہیم ڈار نے شدید نقد وجرح کے باوجود یہ لکھا ہے کہ

"ضخامت کے باوجود اس میں زندگی کی روح بھی موجود ہے اس کتاب کی کامیابی کا ایک سبب مصنف کا علمی تبحر ہے جس کا ثبوت کتاب کے صفحات پر جا بجا ملتا ہے، حیات شبلی کے بعض حاشیے علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت مفید اور قیمتی ہیں۔" (۱۸)

ڈاکٹر عبدالقیوم نے بھی حیات شبلی کو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ قرار دیا ہے۔ (۱۹)

سوانح نگاری میں صاحب سوانح کے محاسن کے ساتھ معائب کا بیان بھی ضروری قرار دیا جاتا ہے، حیات شبلی اس اصول سوانح نگاری پر بھی پوری اترتی ہے، چنانچہ سید صاحب نے حیات شبلی میں علامہ شبلی کے محاسن کے ساتھ نقائص اور خامیوں کے بیان سے اغماض نہیں برتا، مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقیا اور مذہبی تورع اور تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا۔" (۲۰)

مگر یہ سچ ہے کہ محاسن کے مقابلہ میں معائب کا پلہ ہلکا ہے ممکن ہے حیات شبلی میں اور بھی فنی خامیاں ہوں لیکن اس کی تاریخی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں، شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"حیات شبلی میں فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے اور دیار پورب کی کوئی سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے اس کے احسان سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے۔" (۲۱)

حوالے

(۱) حیات شبلی ص ۱

(۲) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۳۳۰

(۳) ایضاً ج ۲ ص ۱۰۷

(۴) حیات شبلی ص ۱۷

(۵) ایضاً ص ۲۵

(۶) تنقیدی نقوش ص ۳۳ و تنقیدی اشارے ص ۱۹۶

(۷) علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات ص ۱۸۶

(۸) حیات شبلی ص ۱۰

(۹) ہم نفسان رفتہ ص ۲۷

(۱۰) تنقیدی اشارے ص ۱۹۳

(۱۱) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۲۵ و ۱۳۴

(۱۲) مضامین ڈار ص ۲۴۰

(۱۳) شبلی نامہ ص ۷

(۱۴) ایضاً ص ۷-۱۱

(۱۵) ایضاً

(۱۶) تنقیدی اشارے ص ۱۵۳

(۱۷) حیات شبلی ص ۸-۹

(۱۸) مضامین ڈار ص ۲۴۲

(۱۹) تنقیدی نقوش ص ۳۳

(۲۰) حیات شبلی ص ۳۲

(۲۱) شبلی نامہ ص ۱۱

☆☆☆

عالم اسلام میں شبلی شناسی

علامہ شبلی کی عظمت، عبقریت، فکروخیال کی بلندی اوران کے علمی کارناموں کی تابندگی کا سارا زمانہ معترف ہے، اس اعتراف کمال کا آغاز اپنے عہد کے سب سے بڑے دانشور عالی دماغ اور مصلح سرسید احمد خاں کے قلم سے ہوا، ۱۸۸۷ء میں علامہ شبلی کی مشہور کتاب المامون شائع ہوئی تو اس کا مقدمہ سرسید نے لکھا اور شبلی کی مورخانہ بصیرت اور سادہ و پرکار نثر کی تحسین وستائش سے نوجوان شبلی کو بزرگوں کی صف میں لاکھڑا کیا، یہی مقدمہ دراصل شبلی شناسی کا نقطۂ آغاز ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے تحقیقات شبلی منصۂ شہود پر آئیں اور اس دور کے ارباب کمال کو گرویدہ کرگئیں، ان کی کتاب الجزیہ کے بارے میں سرسید نے یہاں تک لکھا کہ ''اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ جزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہیں کہ فاتوابسورۃ من مثلہ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ (۱)

کالج کو نقصان پہنچنے کے اندیشہ سے سرسید الفاروق کی تصنیف کے حق میں نہ تھے باوجود اس کے جب مولوی سراج الدین نے شبلی پر تقدم حاصل کرنے کے لئے سیرۃ الفاروق لکھی تو سرسید نے ناگواری کا اظہار کیا اور شبلی کی پختہ تصنیفی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی۔ (۲)

ان اعترافات سرسید نے قوم میں شبلی کا رتبہ بہت بلند کیا لیکن شبلی کے علمی کارناموں کا شہرہ عالم اسلام میں اس سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ علامہ شبلی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

''ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں، شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے، میں بھی اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا

تھا، انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ اہا ! یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق
میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا
شکر اللہ مساعیہ، شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی
تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے
پیش آئے مجھ کو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں
نے اسے نگاہ قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی۔'' (۳)

اس سفر میں علامہ شبلی نے ترکی سپہ سالار غازی عثمان پاشا سے ملاقات کی، وہ ۱۸۷۷ء کی جنگ روم وروس کے ہیرو تھے ان کی بہادری اور جانبازی کی وجہ سے جنگ کا نقشہ بدل گیا تھا، علامہ شبلی ان سے بہت متاثر تھے، چنانچہ ان سے ملنے گئے اور ملاقات کے وقت جب ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں تھا علامہ شبلی نے غازی موصوف سے درخواست کی کہ اسی ہاتھ سے آپ نے کفار کو قتل کیا تھا، اس کے چومنے کی اجازت دیجئے، غازی موصوف نے کہا کہ دراصل آپ کا ہاتھ چومنے کے قابل ہے جس نے علمی خدمات انجام دیں اور یہ کہہ کر مولانا کا ہاتھ چوم لیا۔ (۴)

علامہ شبلی کو ترکوں سے بڑی محبت تھی یہ ملاقات بھی دراصل اسی محبت کا حصہ تھی، اور اسی ملاقات نے شبلی کو ترکوں کا ہیرو بنا دیا، غازی عثمان پاشا نے سلطان عبدالحمید سے علامہ شبلی کو تمغہ مجیدیہ سے سرفراز کرنے کی درخواست کی جو منظور ہوئی، اس کی دلچسپ روداد علامہ شبلی کے قلم سے ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے مکان میں سو رہا تھا کہ میرے ایک
دوست دوڑے ہوئے آئے اور جگا کر کہا یا شبلی واللہ لقد طلع لک
النیشان مجھ کو ایک گونہ تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ یوں ہی کہتے ہو، آخر تم کو
معلوم کیونکر ہوا، بولے کہ تمام اخبارات میں چھپ گیا ہے، میں اسی وقت اٹھا
اور ایک قرأت خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو واقعی وہ خبر صحیح تھی...... دوسرے دن

تمام احباب مبارک بادکو آئے میں نے ایک مختصر سا جلسہ دعوت ترتیب دیا، شیخ علی ظبیان، عبد السلام آفندی، فواد، سامی، شریف اور دیگر احباب شریک جلسہ تھے، دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی وداعی ملاقات کو گیا، تمغہ کی خبر ایسی عام ہوگئی تھی کہ پاشائے موصوف کے مکان پر پہونچا تو سب سے پہلے دربان نے کہا تمغہ مجیدی مبارک .... پاشائے موصوف نے ملاقات کے ساتھ تمغہ کی مبارک باد دی، تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا بکس سے نکال کر پہلے آنکھوں سے لگایا پھر مجھ کو حوالہ کیا، میں سروقد کھڑا ہو گیا اور سلطان کو دعا دی۔"(۵)

علامہ شبلی پونے تین ماہ قسطنطنیہ میں رہے پھر وہاں سے شام کا رخ کیا اور فلسطین و مصر ہوتے ہوئے واپس ہندوستان آئے، اس کے بعد ترکوں سے ان کے کیا روابط رہے اس کی کوئی تفصیل ان کی سوانح یا مکاتیب میں نہیں ملتی، ترکوں نے علامہ شبلی کو یاد رکھا یا نہیں؟ وہاں ان پر کوئی تحقیقی کام ترکی یا اردو زبان میں ہوا یا نہیں؟ اس کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں البتہ ایک عرصہ بعد ۱۹۲۶ء میں محمد عمر رضا کحالہ آفندی نے علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق تصنیف الفاروق کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا، اور اس محبت کا حق ادا کیا جو علامہ شبلی کو خاص طور سے ترکوں سے تھی، یہ ترجمہ آمدی مطبع سی استنبول سے ۱۹۲۶ء مطابق ۱۳۴۵ھ میں حضرت عمرؓ کے نام سے شائع ہوا، اور اس قدر مقبول ہوا کہ محض دو سال بعد ۱۹۲۸ء میں کون طوغدی مطبع استنبول سے دوبارہ شائع ہوا۔

محمد عمر رضا آفندی نے علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کو بھی ترکی جامہ پہنایا جسے بڑے اہتمام سے کتب خانہ آثار علمیہ قسطنطنیہ نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا، یہ دونوں ترجمے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں لیکن ترکی زبان سے ناواقفیت کے سبب یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ ترجمے کس معیار کے ہیں اور مترجم کی اردو زبان پر کس درجہ دست رس تھی، باوجود تلاش بسیار کے عمر رضا آفندی کے حالات بھی معلوم نہ ہو سکے لیکن اس قدر تو واضح ہے کہ اس ترکی شبلی شناس کو علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات سے غایت درجہ تعلق ضرور تھا۔

محمد عمر رضا آفندی نے علامہ شبلی کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی کی بھی بعض کتابوں کے ترکی زبان میں ترجمے بڑے اہتمام سے شائع کئے، اس کے بعد ترکوں نے علامہ شبلی کو کس قدر یاد رکھا یا ان کے افکار و خیالات کو سمجھنے کی کیا کچھ کوشش کی، اس کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں، ابھی حال ہی میں ترکی یونیورسٹی میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کی فہرست شائع ہوئی ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس میں ایک بھی مقالہ علامہ شبلی کے متعلق نہیں ہے۔(۶)

عہد شبلی میں مصر ایک بڑا اہم علمی مرکز تھا، خاص طور سے وہاں کے اہل علم اور ارباب کمال کا علمی اشتغال اور وہاں کی عربی مطبوعات ہر طرف مقبول تھیں یہی وجہ تھی کہ علامہ شبلی نے ممالک اسلامیہ کے سفر میں مصر کو بھی شامل کیا اور وہاں کے علمی و تعلیمی مراکز کا جائزہ لیا، عربی رسائل و جرائد اور جدید مصری مطبوعات کی وجہ سے بعض مصری اہل قلم سے علامہ شبلی کے روابط قائم ہو گئے تھے، انھیں میں متعصب عیسائی مصنف جرجی زیدان بھی تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔(۷) جرجی زیدان نے بھی علامہ شبلی سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب تاریخ التمدن الاسلامی جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں علامہ شبلی کے علمی کمالات کا اعتراف اس طرح کیا ہے:۔

> ''یورپین کتابوں میں عربوں کے جو قابل ذکر واقعات بیان ہوئے ہیں ان کا سراغ مجھ کو اصل عربی ماخذ میں نہیں ملتا تھا جس کی بنیاد پر اس کی صحت مجھ کو مشکوک معلوم ہوتی تھی کیونکہ یہ واقعات عہد وسطیٰ کے یورپین سفرناموں سے ماخوذ ہیں اور اکثر واقعات محتاج تحقیق ہیں، مجھ کو اردو زبان میں لکھی ہوئی علامہ شبلی کی کتاب رسائل شبلی دستیاب ہوئی جس میں مستند حوالوں کے ساتھ عرب کے مدارس، شفاخانے، کتب خانے اور عربوں کی تصنیفات کا ذکر متعدد فصلوں میں ہے، در حقیقت یہ ایک عظیم الشان تصنیف ہے اس کے واسطہ سے اس موضوع پر علماء کی آراء واقوال کو پڑھ کر جب میں نے اصل ماخذ کی

طرف رجوع کیا اور دقت نظر سے واقعات کی جستجو کی تو مجھ کو حیرت انگیز تمدنی سرمایہ ہاتھ آیا۔" (۸)

جرجی زیدان نے اپنی کتاب میں حوالوں کا اہتمام نہیں کیا تھا ایک خط لکھ کر علامہ شبلی نے اس کی طرف اسے متوجہ کیا، جرجی زیدان نے لکھا کہ:

"ہم کو ہمارے ہندی نژاد عالم دوست شبلی نعمانی جن کے مکتوب کا خلاصہ ہم نے پچھلی جلد کے مقدمہ میں درج کیا ہے یہ توجہ دلائی تھی کہ ہم حوالے میں ماخذ کے صفحات کی صراحت بالالتزام کریں چنانچہ ہم نے اس جلد میں اس پر عمل کیا ہے۔" (۹)

مگر جرجی زیدان نے اس اعتراف کے باوجود فریب سے کام لیا اور عربوں کے تمدن کے ذکر میں ان کی تحقیر وتذلیل کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا، اس کی اس دسیسہ کاری کی وجہ سے علامہ شبلی نے اس کا رد لکھا جو الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی کے نام سے شائع ہوا، شبلی کی یہ کاوش جو ہندوستان سے بڑھ کر مصر میں مقبول ہوئی اور وہاں کے اہل علم ودانش نے اس کی اہمیت اور ضرورت کا اعتراف کیا ان میں مجلّہ المنار کے ایڈیٹر اور مصر کے نامور فاضل شیخ رشید رضا کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، انھوں نے الانتقاد کو اپنے رسالہ المنار میں قسط وار شائع کیا اور لکھا کہ:

"اس وقت شیخ شبلی نے جو علامہ وقت، مشہور مصلح، جمعیۃ ندوۃ العلماء کے بانی اور اس کے ترجمان رسالہ (الندوہ) کے مدیر ہیں انھوں نے تاریخ التمدن الاسلامی کی تردید لکھنی شروع کی ہے اور ہم کو یہ لکھا ہے کہ وہ اس کو لکھنؤ میں چھپوا رہے ہیں اور اس کے مطبوعہ فارم وہ ہمارے پاس بتدریج بھیجتے رہیں گے تاکہ ہم انھیں المنار میں چھاپ دیں، ایسے عالم ومورخ کی تنقید درحقیقت ہمارا قیمتی علمی سرمایہ ہے اور صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ ہمارے اور ان کے دوست جرجی زیدان کا بھی، اس لئے ہم نے اس کو شائع کرنے میں عجلت کی۔" (۱۰)

جرجی زیدان کی تردید کے لئے رشید رضا مصری نے علمائے مصر کو آمادہ کرنا چاہا مگر ان لوگوں نے ہمت نہ کی۔(۱۱) وہ خود بھی اس کی تردید کرنا چاہتے تھے انھوں نے علامہ شبلی کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ''میں خود بھی تردید کرنا چاہتا تھا مگر جرجی زیدان کے مکائد اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو سمیٹ کر یکجا کرنا اور ان کی تردید کرنا قابو میں نہ آتا تھا، آپ نے اس پر قابو پالیا اور تردید کردی۔(۱۲)

شیخ رشید رضا مصری نے الانتقاد قسط وار شائع کرنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں مطبع المنار سے اسے کتابی صورت میں شائع کیا، اس کی اشاعت کے بعد جرجی زیدان نے علامہ شبلی کو خط لکھا اور بیس سالہ قدیم تعلقات کا پاس نہ رکھنے کا شکوہ کیا اور وعدہ کیا کہ آپ کی مرضی کے مطابق کتاب میں ترمیم و تنسیخ کردی جائے مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ الانتقاد کی اپنی نسبت سے انکار کردیں مگر علامہ شبلی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا (۱۳) مولانا سید سلیمان ندوی نے الانتقاد کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس کتاب کی اشاعت سے ہندوستان اور مصر اور دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں جہاں تک (جرجی زیدان کی) تمدن اسلامی کا زہر پھیلا تھا تریاق کا کام دیا اور ایک بڑے فتنہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔(۱۴)

سیرۃ النبیؐ کی ابتدائی دونوں جلدیں ترکی میں ترجمہ ہوکر پہنچیں تو مصر یونیورسٹی کے بعض نامور فاضلوں نے اس سے بڑی دلچسپی لی، خاص طور سے پروفیسر عبدالوہاب عزام نے جو اردو اور فارسی کے استاذ تھے ان میں سیرۃ النبی کے عربی ترجمہ کا داعیہ پیدا ہوا، چنانچہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ:

> ''میں نے آپ کی سیرۃ نبویہ کا ترکی ترجمہ پڑھا تو اس کو میں نے اس لائق پایا کہ خود قرآن کی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے اس لئے میں نے اور چند ہندوستانی بھائیوں نے ارادہ کیا ہے کہ ہم عربی میں اس کا ترجمہ کریں۔''(۱۵)

مگر عزام مرحوم یہ کام انجام نہ دے سکے، اس کے بعد مصر ہی سے مولانا محمد اسماعیل

ندوی مدراسی نے اس کام کی اجازت چاہی جسے ارباب دارالمصنفین نے بخوشی منظور کیا انھوں نے بڑے اہتمام سے یہ کام انجام دیا البتہ اس دوران مولانا مدراسی مصر سے الجزائر منتقل ہوگئے اور وہیں وفات پائی، ان کے علمی متروکات جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے حصے میں آئے۔ افسوس کہ وہاں کے کسی اہل علم کے دل میں اس کی طباعت واشاعت کا خیال پیدا نہیں ہوا، یہ ترجمہ اب دارالمصنفین کے پاس ہے اور وہ اس کی اشاعت کی فکر میں ہے۔

ان کوششوں کے بعد مصر اور مصری ارباب نظر نے شبلی پر کیا کام کیا اور ان کے علمی کمالات کا کس درجہ اعتراف کیا اس کی کوئی تفصیل راقم کو دستیاب نہ ہوسکی۔

شعرالعجم نہ صرف علامہ شبلی کا عظیم الشان کارنامہ ہے بلکہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن ترین باب بھی ہے، پانچ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب دراصل عالمی ادب کا حصہ ہے، فارسی شعروادب پر ایسی معرکہ آراء کتاب اب تک ایران میں بھی نہیں لکھی جاسکی، یہی وجہ ہے کہ اپنی تصنیف سے لے کر اب تک یہ کتاب اہل علم کی آنکھوں کا نور بنی ہوئی ہے، لٹریری ہسٹری آف پرشیا کے مصنف پروفیسر براؤن اس کی عظمت کے معترف ومداح تھے، انھوں نے اپنی کتاب میں اس سے استفادہ بھی کیا تھا، ان کی تمنا تھی کہ کاش شعرالعجم فارسی اور انگریزی میں ترجمہ ہوجاتی (۱۶)، ان کی یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ ایران وافغانستان میں اس کی تمام جلدوں کا ترجمہ ہوا۔

ایران کے بعد ہندوستان فارسی شعروادب کا دوسرا بڑا گہوارہ تھا، علامہ شبلی اس گہوارہ علم وادب کے آخری مسافر تھے ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ غالب پر نہیں بلکہ شبلی پر ہوا، فارسی شعروادب پر جس قدر گہری نگاہ ان کی تھی ان کے معاصرین میں شاید ہی کسی اور کی رہی ہو، یہی وجہ ہے کہ شبلی کی تصنیفات جس قدر ترکی اور مصر میں مقبول ہوئیں، اسی طرح ایران وافغانستان کے اہل علم نے بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا، چنانچہ ایک ایرانی شبلی شناس سید محمد تقی فخر داعی گیلانی (وزارت معارف تہران) نے اپنی زندگی کا بیش قیمت حصہ تصنیفات شبلی کے ترجمہ واشاعت میں صرف کیا، وہ ایران کے نامور عالم ومترجم اور ملا محمد کاظم خراسانی

اور شیخ عبداللہ مازندرانی کے شاگردوں میں سے تھے، تحصیل علم کے بعد اپنے استاذ خراسانی کی خواہش پر داعی اسلام کی حیثیت سے ہندوستان آئے، بمبئی میں دعوت وتبلیغ کا کام کیا پھر اندور کے کسی کالج میں فارسی وعربی کے استاذ ہو گئے اردو اور انگریزی پر عبور حاصل تھا، یہیں وہ شبلی سے واقف ہوئے اور ان کی تصنیفات کے ترجموں کا آغاز کیا پھر وہ ایران واپس گئے اور وزارت معارف تہران سے وابستہ ہو کر تصنیف وتالیف وترجمہ میں زندگی گذار دی، شبلی کے علاوہ گستاولی بان، امیر علی اور سرسید احمد خاں کی بھی بعض کتابوں کا انھوں نے فارسی میں ترجمہ کیا، وہ پختہ اہل قلم مصنف اور مقالہ نگار تھے، اہل علم نے انھیں فخر المحققین کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ۱۳۴۳ش میں تہران میں وفات پائی اور قم میں سپرد خاک کئے گئے۔

انھوں نے سب سے پہلے شعرالعجم کو فارسی میں منتقل کیا، اس کی پہلی جلد ۱۳۱۶ش میں شائع ہوئی، دوسری جلد ۱۳۱۴ش، تیسری جلد ۱۳۱۹ش، چوتھی جلد ۱۳۲۰ش اور پانچویں جلد ۱۳۲۴ش میں شائع ہوئیں۔

شعرالعجم کے یہ ترجمے اس قدر مقبول ہوئے کہ جلد ہی دوسرے ایڈیشن بھی شائع ہوئے مثلاً پہلی جلد ۱۳۱۶ش کے بعد ۱۳۳۵ش میں دوسری جلد ۱۳۳۹ش میں تیسری جلد ۱۳۳۴ش میں چوتھی جلد ۱۳۳۶ش میں اور پانچویں جلد ۱۳۳۷ش میں دوبارہ طبع ہوئیں، طبع اول ودوم کے اکثر نسخے راقم کی نظر سے گذرے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فخر داعی گیلانی نے بڑے اہتمام سے ترجمہ کیا ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ انھوں نے حق ادا کر دیا ہے۔

ترجمے کا حق انھوں نے ادا کیا ہو یا نہ کیا ہو شبلی شناسی کا حق ضرور ادا کر دیا ہے، ان ترجموں پر انھوں نے جو مقدمے اور دیباچے لکھے ہیں اس میں انھوں نے نہ صرف شعرالعجم کی تعریف وتحسین کی ہے بلکہ علامہ شبلی کی نقادانہ بصیرت اور فارسی شعر وادب پر ان کی گہری نگاہ، ژرف بینی اور نکتہ شناسی کی کھل کر داد دی ہے، تفصیل سے ان کے حالات اور کمالات کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مقدمہ کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:-

شبلی نعمانی یکے از نویسندگان نامی ومبرز شبلی نعمانی دور حاضر کے ہندوستان کے

قرن حاضر ہندوستان است کہ بواسطہ	ایک نامور اہل قلم ہیں وہ اپنے تاریخی،
جنبہ تاریخی و فلسفی و نیز احاطہ ای کہ	فلسفیانہ نیز ادبی کمالات کی وجہ سے تمام
بادبیات معاصر دارد درمیان خواص	ممالک بالخصوص ترکی، شام، مصر، حجاز اور
ہر مملکتی خاصہ ترکیہ، سوریہ، مصر حجاز،	افغانستان میں اہل علم میں معروف
افغانستان معروف است۔(۱۷)	ہیں۔

تیسری جلد میں مشہور ایرانی مصنف سعید نفیسی کا مقدمہ شامل ہے جس میں انھوں نے علامہ شبلی کی وسعت معلومات اور تحقیق و تجزیہ کی مدح و ستائش کی ہے اور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں فارسی شعر و ادب کا زبردست نکتہ شناس قرار دیا ہے۔

شعر العجم کے یہ تراجم تہران کے مشہور کتب خانہ ابن سینا نے شائع کئے، طباعت واشاعت کا بھی خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، یہ ترجمے طبع ہو کر جب دار المصنفین پہونچے تو مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں اس کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا اور لکھا کہ:

”مولانا شبلی مرحوم کو اپنی زندگی میں شاید اپنی کتاب شعر العجم کی اس مقبولیت کا خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ ایک طرف وہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کا آخری ماخذ بنے گی اور دوسری طرف خود وہ ملک جس کی ادبی تاریخ اس میں لکھی گئی ہے اس کی اتنی قدر کرے گا کہ اس کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا اہتمام کرے گا، شعر العجم کی پانچویں جلد جو ان کی تحقیقات کا خلاصہ ہے اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے فارسی میں ترجمہ ہو کر طہران میں چھاپی گئی ہے، آقائی سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔“(۱۸)

ایران میں نہ صرف شعر العجم بلکہ علم الکلام اور سوانح مولانا روم سے بھی دلچسپی لی گئی، فخر داعی گیلانی نے انھیں بھی فارسی جامہ پہنایا، علم الکلام کا ترجمہ ۱۳۲۸ ش میں تہران سے شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۳۰ ش میں طبع ہوا، اسی طرح سوانح مولانا روم کا ترجمہ ۱۳۳۲ ش میں تہران میں شائع ہوا یہ بھی آقائی سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہی کے قلم سے ہے۔

فخر داعی گیلانی نے شبلی کی کتابوں کے علاوہ ان کے ایک مشہور مضمون کتب خانہ اسکندریہ کو بھی فارسی جامہ پہنایا جو رسالہ کی شکل میں ۱۳۱۵ھ میں تہران سے شائع ہوا، ممکن ہے ان کے علاوہ بھی آقائی گیلانی نے ترجمے کیے ہوں اور وہاں تک ہماری رسائی نہ ہو سکی ہو۔

فخر داعی گیلانی کے تراجم سے خطہ فارس میں شبلی کی عظمت کا ڈنکا بج گیا اور بعد کے متعدد نامور ایرانی اہل قلم نے اپنی کتابوں میں شبلی اور شعر العجم کا والہانہ ذکر کیا، استاذ علامہ محمد علی مدرس نے ریحانۃ الادب میں ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

شبلی نعمانی ہندی در اوائل قرن حاضر چہاردہم ہجرت از علمائے اسلامی ہند بود، در بلاد اسلامی سیاحتہا کردہ واز مقتضیات، اطلاعات کافی بہم رسانید، ہر سہ زبان فارسی و عربی و ہندی را خوب میدانست واز تالیفات اوست: [۱] انتقاد کتاب تاریخ التمدن اسلامی جرجی زیدان کہ در قاہرہ چاپ شدہ است [۲] تاریخ عمر بن خطاب [۳] کتاب الجزیہ کہ در ہند چاپ شدہ است، نعمانی در سال ہزار وسی صد و دویم ہجری درگذشت۔ (۱۹)

علامہ شبلی نعمانی چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان کے علمائے اسلام میں تھے، انھوں نے اسلامی ممالک کی سیاحت کی اور وہ زمانہ کے حالات اور تقاضوں سے بہت باخبر تھے، فارسی، عربی اور اردو تینوں زبانوں سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی تصنیفات میں [۱] انتقاد تاریخ التمدن الاسلامی جرجی زیدان جو قاہرہ میں چھپی ہے [۲] تاریخ عمر بن خطاب (الفاروق) اور [۳] کتاب الجزیہ ہیں جو ہندوستان میں چھپی ہیں۔ ۱۳۳۲ھ میں انتقال ہوا۔

مشہور ایرانی مصنف سعید نفیسی نے شعر العجم کی تحسین ان الفاظ میں کی ہے:-

کسانیکہ کارشان بحث و فحص در ادب فارسی ست می دانند کہ ایں کتاب ہموارہ راہ بروشن بین ایشاں دریں راہ

فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ہمیشہ رہنما اور روشنی ثابت ہوگی کیونکہ شبلی نے اپنی کتاب

دشوار خواهد بود، شبلی دریں کتاب استادی خود را در نقادی و موشگافی آشکار کردہ است و راستی جائے شگفتہ است کہ دور از ایران کسے کہ پا بہ ایران نہ گذاشت و با فارسی زبانان آمیزش شبا نروزی نداشتہ است بدیں گونہ برموز ایں زبان آشنا بودہ و تا ایں اندازہ آرا مصاب دربارہ ایں دشوار یہا بیان کردہ باشد (۲۰)

میں اپنی نقادانہ موشگافیاں اور مہارت ظاہر کردی ہے تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو ایران سے بہت دور ہو اور جس نے ایران کی سرزمین پر کبھی قدم نہ رکھا ہو اور نہ ہی اسے اہل زبان کے ساتھ صحبت میسر رہی ہو وہ اس زبان کے رموز سے اس قدر آشنا اور اس کی مشکلات کے بارہ مین اپنی صائب رائے کس طرح دے سکا۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، احمد گلچیں معانی، توفیق سبحانی، علی اصغر حکمت وغیرہ نے بھی شبلی اور شعر العجم سے دلچسپی لی اور اپنی کتابوں، ترجموں اور مضامین میں مدح وستائش کی (۲۱) فارسی زبان کے ایک اور دائرۃ المعارف لغت نامہ دھخدا میں بھی علامہ شبلی کا تذکرہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے:-

شبلی نعمانی ملقب بہ شمس العلماء مورخ، ادیب، نویسندہ، شاعر، مصلح اسلامی ہند محقق و برہمنی الاصل جد سوم او سوراج سنگ معروف بہ سراج الدین اسلام آورد، شبلی نعمانی در قریہ بندول از توابع اعظم گر بہ سال ۱۲۷۴ھ پائی بہ دنیا گزارد دورہ تحصیلات را در رام پور ولاہور و سہارن پور گرداند و بہ حج رفت، و در سال ۱۳۰۰ھ دانش گاہ علی گر

شمس العلماء، علامہ شبلی نعمانی مورخ، ادیب، مصنف شاعر و محقق اور ہندوستان کے اسلامی مصلح، برہمن نژاد تھے ان کی اوپر کی تیرہویں پشت میں شیوراج سنگھ اسلام لائے جو سراج الدین کے نام سے موسوم ہوئے، اعظم گڑھ ضلع کے گاؤں بندول میں ۱۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے، تحصیل علم کے لئے رام پور، لاہور اور سہارن پور کا سفر کیا پھر حج بیت اللہ سے

تدریس ادبیات ادبی می نمود در اشاعه
فرہنگ و ادبیات مجددانہ اقدام می کرد
وزبان عربی وفارسی را خوب
میدانست از آثار اوست شعرالعجم
انتقاد تاریخ تمدن اسلام جرجی زیدان،
جزیہ، مجلہ معارف، شبلی در سال
۱۳۳۲ھ درگذشت۔ (۲۲)

مشرف ہوئے، ۱۳۰۰ھ میں دانش گاہ علی
گڑھ میں ادبیات کی تدریس پر مامور
ہوئے، زبان وادب کے فروغ میں نمایاں
حصہ لیا ان کو عربی وفارسی زبان پر عبور تھا
ان کے کارناموں میں شعرالعجم، انتقاد
تاریخ تمدن اسلامی، جزیہ اور مجلہ معارف
ہیں، ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی۔

اس تذکرہ میں اگرچہ بعض غلطیاں درآئی ہیں مثلاً علامہ شبلی برہمن الاصل کی بجائے راج پوت نسل سے تھے اور مجلہ معارف ان کی وفات کے بعد شائع ہوا وغیرہ، تاہم یہ خود بڑی عظمت کی بات ہے کہ فارسی زبان وادب کے تذکروں میں اردو کے مایہ ناز ادیب وانشاء پرداز اور عالم ومورخ کی عظمت کا ذکر بار بار ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ایرانی اہل قلم نے شبلی شناسی کا حق ادا کردیا، شبلی جس قدر ایران میں مقبول ہوئے اور جس قدر اہل فارس نے ان کی قدردانی کی اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی، فخر داعی گیلانی کے علاوہ بھی متعدد ایرانی اہل قلم نے شبلی شناسی میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن شبلی شناسی کی تاریخ میں جو مقام فخر داعی گیلانی کو حاصل ہے اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

علامہ شبلی کو ایران سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ اس کا سفر بھی کرنا چاہتے تھے لیکن وہ تو نہ پہنچ سکے البتہ ان کی ادبی تصنیفات ایران ضرور پہنچیں اور سچ یہ ہے کہ دلوں پر چھا گئیں۔

افغانوں سے علامہ شبلی کی کسی خصوصی دلچسپی کا ذکر ان کے حالات میں نہیں ملتا لیکن خود افغانستان کے اہل علم نے ہمیشہ ان کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کی اہمیت اور بلند پایگی کا اعتراف کیا، والی کابل امیر عبدالرحمٰن نے ترجمے کا محکمہ قائم کیا تو علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری منتخب کیا مگر علامہ شبلی نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا (۲۳) غالباً ان کے انکار کی وجہ سے

یہ محکمہ قائم نہ ہوسکا البتہ ایک عرصہ بعد جب افغانستان میں انجمن ادبی کابل کا قیام عمل میں آیا تو اس کے سرگرم اہل علم وقلم نے علامہ شبلی کے فکروخیال اوران کی تصنیفات کی اشاعت سے بڑی دلچسپی لی اس کا اندازہ علامہ شبلی کی مندرجہ ذیل تصنیفات کے ترجمے سے لگایا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے منصور انصاری نے شعرالعجم کی تین جلدوں اول دوم اور پنجم کو فارسی میں منتقل کیا جو علی الترتیب ۱۳۰۶ش، ۱۳۰۶ش اور ۱۳۰۷ش میں کابل سے شائع ہوئے، جلد سوم کا مشہور افغان شاعر سرور خاں گویا نے فارسی میں ترجمہ کیا جو ۱۳۱۵ش میں انجمن ادبی کابل سے طبع ہوا، سرور خاں گویا کو شبلی اور دارالمصنفین سے بڑا تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا چنانچہ جب وہ ہندوستان تشریف لائے تو دارالمصنفین بھی آئے اوراس کے مہمان خانے میں تین روز تک مقیم رہے۔ (۲۴) گویا صاحب کا شمار افغانستان کے مشاہیر ادباء وشعراء میں ہوتا ہے وہ انجمن ادبی کے روح رواں بھی رہے، ان کے ترجمہ شعرالعجم کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں لکھا کہ:

> ''شعرالعجم کی دوپہلی جلدوں کے فارسی ترجمے پہلے نکل چکے تھے اب
> کابل کی مجلس ادبی کی طرف سے اس کی تیسری جلد کا فارسی ترجمہ شائع ہوا ہے
> اس کے فارسی مترجم سرور خاں گویا خود فارسی ادبیات کے ذوق شناس ہیں اس
> لئے اس کا ترجمہ بھی بہت اچھا ہوا ہے امید ہے کہ قند ہندی سے ایران وکابل
> کے طوطیان سخن ''شکرشکنی'' کا لطف اٹھائیں گے۔'' (۲۵)

افغانستان ہی میں شعرالعجم کی چوتھی جلد کو برہان الدین کشلکی نے فارسی قالب عطا کیا جو ۱۳۰۶ھ میں لاہور سے شائع ہوا، یہ ترجمے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

الفاروق علامہ شبلی کی معرکہ آراء تصنیف ہے افغانوں نے اس سے بھی بڑی دلچسپی لی، اس کے فارسی ترجمہ کی سعادت افغان بادشاہ نادر خاں کی ہمشیرہ اور جناب اسداللہ خاں کی والدہ کے حصے میں آئی، اس کی تصحیح وترتیب کا کام جناب نجف علی عاصی جلال پوری نے انجام دیا، اسے قندھار سے حاجی عبدالستار نے شائع کیا، سنہ طباعت معلوم نہ ہوسکا البتہ اس کا دوسرا

ایڈیشن ۱۳۵۱ھ میں مسلم پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوا، مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے نجف علی عاصی کا ترجمہ بتایا ہے (۲۶) جو صحیح نہیں، اس کا مطبوعہ نسخہ راقم کی نظر سے گذرا ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ یہ ترجمہ نادر خاں کی ہمشیرہ کے قلم سے ہے۔

افغان اہل قلم نے تصانیف شبلی کو فارسی میں منتقل کرنے کے علاوہ اپنی علاقائی زبان پشتو میں بھی ترجمہ واشاعت کا کارنامہ انجام دیا، ان کی علامہ شبلی سے حد درجہ عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سیرۃ النبی کی دو دو ترجمے ایک ہی ادارے سے شائع ہوئے، اولاً برہان الدین کشلکی نے سیرۃ النبی کے دونوں جلدوں کا پشتو ترجمہ کیا جو ۱۳۲۶ش اور ۱۳۲۸ش میں پشتو تولنہ کابل سے شائع ہوئے، پھر انھیں دونوں جلدوں کو عزیز الرحمٰن سیفی نے پشتو میں منتقل کیا جو پشتو تولنہ کابل ہی سے ۱۳۵۰ش اور ۱۳۵۴ش میں چھپے، یہ تمام مطبوعہ نسخے دار المصنفین میں موجود ہیں اور راقم کی نظر سے گذر چکے ہیں، سیرۃ النبی کا ایک اور پشتو ترجمہ محمد اسرائیل کے قلم سے ہے اسے پشتو اکیڈمی پشاور نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

پشتو دانشور غلام قادر نے الفاروق کو بھی پشتو جامہ پہنایا جو ۱۹۴۹ء میں کراچی سے شائع ہوا یہ راقم کو دستیاب نہ ہوسکا۔

ان تراجم کے علاوہ افغان اہل علم وقلم نے شبلی شناسی کے میدان میں اور کون سے کارنامے انجام دیئے، راقم اس سے واقف نہ ہوسکا اور اب تو افغانستان کی بربادیوں کے قصے زبانوں پر ہیں خدا بہتر جانے اب وہاں علم وتحقیق کا کیا حال ہے؟

ترک، ایرانی اور افغان اہل قلم اور ارباب نظر نے علامہ شبلی اور ان کے کارناموں سے جس قدر دلچسپی لی اس کے مقابلہ میں عربوں نے کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی حالانکہ علامہ شبلی جرجی زیدان کی تحقیر عرب پر چراغ پا ہو گئے تھے اور اس کے رد میں الانتقاد عربی زبان میں قلم بند کی تھی جس کا ذکر مصر کے مشہور مجلہ المنار میں ہوا تھا، ممکن ہے اس دور میں کہیں کچھ لکھا گیا ہو لیکن اب اس کا کہیں ذکر نہیں البتہ خیر الدین زرکلی نے الاعلام میں ان کا تذکرہ بڑے جامع انداز میں لکھا ہے۔

شبلی نعمانی: باحث من رجال
الاصلاح الاسلامی فی الهند
اعتنق الاسلام جده الثالث
عشر سوراج سنگھ تسمی
سراج الدین ولد شبلی فی
قریة بندول من اعمال اعظم
کر، تعلم فی رام بور ولاهور
وسهارن بور وحج فاتصل
بکثیر من رجال العلم وانتدبه
مؤسس جامعه علی کر
لتدریس علوم العربیة سنة
الف وثلاث مأة عشر ١٣٠٠ھ
فیها فکان عونا له علی
النهوض بالجامعة وصنف کتباً
جلیله بلغة بعضها بالعربیة
وشارک فی اخشاء دارالعلوم
التابعة لندوة العلماء فی لکنؤ
وانشاء دارالمصنفین فی بلدة
فانصدرت مأة من الکتب ولها
مجلة اسمعها معارف وکان
وثیق الصلة بالعالم الاسلامی
ونهضاته السیاسیة والاجتماعیة

علامہ شبلی ہندوستان کے ایک محقق
اور مذہبی مصلح تھے ان کے اجداد کی
تیرہویں پشت مین شیوراج سنگھ نے
اسلام قبول کیااور سراج الدین کے نام
سے موسوم ہوئے، وہ ضلع اعظم گڑھ
کے ایک گاؤں بندول میں پیدا
ہوئے، رام پور، لاہور اور سہارن پور
میں تعلیم پائی، اس کے بعد حج کیا اور
حجاز کے اکثر علماء سے ملاقات کی،
١٣٠٠ھ میں جامعہ علی گڑھ میں عربی
زبان کی تدریس پر مامور ہوئے اور
اس کی ترقی کے لئے بڑی کوششیں
کیں، عربی میں چند اہم کتابیں
تصنیف کیں پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء
کی تاسیس وتشکیل میں حصہ لیااور اپنے
وطن اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم
کیا، جہاں سے سیکڑوں کتابیں شائع
ہوئیں اور مجلّہ معارف نکل رہاہے،
دنیائے اسلام سے ان کے گہرے
تعلقات تھےاوراس کی سیاسی واجتماعی
بیداری اور ترقی سے انھیں خاص دلچسپی
تھی ان کی عربی تصنیفات میں

وماكتبه بالعربية الانتقاد على تاريخ التمدن الاسلامى لجرجى زيدان الجزية وكان يجيد العربية والفارسية مع الهندية (۲۷)

الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی لجرجی زیدان اور الجزیہ وغیرہ ہیں وہ اردو ہی کی طرح عربی وفارسی کے بھی ماہر تھے۔

ممکن ہے خیرالدین زرکلی کے علاوہ بھی کسی تذکرہ نگار نے ان کا یاان کی تصنیفات کا ذکر کیا ہو لیکن راقم کی وہاں تک رسائی نہ ہوسکی۔

اس سلسلہ کی دوسری کاوش الفاروق کا عربی ترجمہ ہے جو امام محمد بن سعود الاسلامیہ کے استاذ دکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم کے قلم سے ہے، اسے مکتبہ دارالسلام ریاض نے ۱۹۹۹ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا غالباً سعودی عرب میں شبلی شناسی کا یہ پہلا کام ہے، عرب ممالک میں مقیم بعض ہندوستانی اہل قلم نے ہندوستان کے علماء کو وہاں متعارف کرایا اور اس سلسلے کے کئی مقالات شائع ہوچکے ہیں، دکتور سید محمد اکرم ندوی نے علامہ شبلی پر ایک مفصل کتاب شبلی النعمانی علامة الهند الاديب والمورخ الناقد الاريب کے عنوان سے لکھی جو ۲۰۰۱ء میں دارالقلم دمشق سے شائع ہوئی، علامہ شبلی پر عربی میں یہ پہلی کاوش ہے جو عربوں کے معیار ومذاق کے مطابق شائع ہوئی ان کے علاوہ عربی میں شاید ہی کوئی قابل ذکر کام ہوا ہو۔

پاکستان اور بنگلہ دیش میں علم وادب اور تاریخ ورجال کی تاریخ میں علامہ شبلی کا بڑا اہم مقام ہے اور ان دونوں ملکوں میں اہل علم ودانش نے ہر دور میں شبلی شناسی کا حق ادا کیا، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر سید عبداللہ، اختر وقار عظیم، سید یحییٰ احمد ہاشمی اور ڈاکٹر قریشی ابتدائی دور کے چند اہم شبلی شناس ہیں۔

شیخ اکرام کی شبلی نامہ، موج کوثر اور یادگار شبلی کے متعدد مندرجات سے اہل علم نے شدید اختلاف کیا تاہم واقعہ یہ ہے کہ شبلی کے متعلق یہ ایک بھرپور کتاب ہے اور شاید اپنے موضوع کی چند نمائندہ کتابوں میں سے ایک ہے، شیخ اکرام نے تمام اعتراضات کے باوجود یہ اعتراف بھی کیا کہ قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ کسی

معجزے سے کم نہیں (۲۸) اس کتاب نے مطالعہ شبلی کا دروازہ کھولا، چنانچہ محض اس کی بدولت شبلی پر متعدد مضامین ومقالات سپرد قلم کئے گئے۔

اسی طرح وحید قریشی نے شبلی کی حیات معاشقہ لکھ کر علمی دنیا میں ایک طوفان برپا کردیا جس کے جواب میں نہ صرف مضامین بلکہ سید شہاب الدین دسنوی نے ایک اہم کتاب شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں سپرد قلم کی۔

سید عبداللہ واقعتاً شناس تھے، انھوں نے اپنی کتاب سرسید اوران کے نامور رفقاء میں شبلی کی عظمت جس طرح بیان کی اس نے شبلی شناسی کی نہ صرف راہ ہموار کی بلکہ شبلی کے متعلق اچھی رائے نہ رکھنے والوں کے دلوں میں بھی شبلی سے ہمدردی پیدا ہوگئی، ان کا مشہور مقالہ شبلی کے کام کی مجموعی قدر وقیمت اس سلسلے کا نمائندہ مقالہ ہے۔

سید یحیٰ احمد ہاشمی کی کتاب شبلی کا ذہنی ارتقاء بھی اپنے موضوع کی اہم کاوش ہے، ان کے علاوہ بھی متعدد پاکستانی اہل قلم نے شبلی پر کتابیں اور مضامین لکھے، سید محمد آزاد کی شاہکار شبلی، افتخار حسین کی اقبال اور پیروی شبلی، معین الدین انصاری کی شبلی مکاتیب کی روشنی میں، محمد اسحاق شمس کی کتاب شبلی کا تنقیدی شعور، مفتون احمد کی کتاب مولانا شبلی ایک مطالعہ، نصیر الدین کی کتاب شبلی، پاکستانی اہل قلم کی شبلی شناسی کا نمونہ ہیں۔

ان کے علاوہ بعض رسائل مثلاً البصیر چنیوٹ اور کریسنٹ لاہور نے شبلی نمبر شائع کر کے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا، چند اہل علم نے مضامین کے مجموعے بھی مرتب کئے، شبلی نقادوں کی نظر میں از واصل عثمانی۔ مقالات یوم شبلی از عبیداللہ خاں اور مقالات یوم شبلی از حافظ نذر محمد اسی سلسلہ شبلی شناسی کا اہم حصہ ہیں۔

دائرۃ المعارف اسلامیہ اور تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند میں تذکرہ، سندھی اور انگریزی زبان میں تصانیف شبلی کے تراجم اوران کی طباعت واشاعت کے علاوہ سیرۃ النبیؐ، الفاروق اور موازنہ انیس ودبیر کی تلخیصات پاکستانی اہل قلم کی شبلی سے حد درجہ بڑھی ہوئی عقیدت کی مثالیں ہیں۔

پاکستان میں شبلی شناسی کا یہ ایک اجمالی ذکر ہے واقعہ یہ ہے کہ اس کے ذکر کے لئے

ایک دفتر درکار ہوگا اس کا مطالعہ و جائزہ ایک علاحدہ مقالے کا متقاضی ہے۔ البتہ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے بالمقابل ہندوستان میں شبلی کی عظمت زیادہ دلوں میں قائم ہوئی اور یہاں کام بھی زیادہ ہوا اور افکار شبلی کا ہمدردانہ مطالعہ کیا گیا جب کہ پاکستان میں تحقیق وتنقید کے نام پر شبلی کے ساتھ زیادہ تر معاندانہ طرز عمل اختیار کیا گیا۔

بنگلہ دیش میں نسبتاً شبلی پر بہت کم کام ہوا علامہ شبلی کی الغزالی کا بنگالی ترجمہ، خاور کا شبلی نمبر اور آفتاب احمد صدیقی کی کتاب شبلی ایک دبستاں کی اشاعت۔ بہر حال بنگلہ دیش کی شبلی شناسی کا نمونہ ہیں ممکن ہے اور بھی کام ہوئے ہوں، لیکن احقر ان سے واقف نہیں۔

عالم اسلام میں شبلی شناسی کا یہ ایک اجمالی جائزہ ہے، یہ مقالہ اگرچہ تشنہ ہے تاہم اس کے مطالعہ سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں میں شبلی کے فکر وخیال اور ان کی تصنیفات نے بڑی مقبولیت پائی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کے ہمعصروں میں کوئی اس مقبولیت میں ان کا ہم پلہ نہیں۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص ۲۳۳-۲۳۴

(۲) ایضاً ص ۲۳۵

(۳) سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۳۰

(۴) حیات شبلی ص ۲۱۰

(۵) سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۱۱۹

(۶) اردو بک ریویو دہلی، نومبر، دسمبر ۲۰۰۷۔ جنوری، فروری، مارچ، ۲۰۰۸

(۷) حیات شبلی ص ۵۷۸

(۸) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ مقدمہ ص ۳-۵، الہلال مصر، ۱۹۰۴

(۹) ایضاً ص ۴

(۱۰) مجلہ المنار مصر ج ۱۵ عدد ۱، جنوری، ۱۹۱۲

(۱۱) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۸۹

(۱۲) حیات شبلی ص ۵۸۱

(۱۳) البصیر شبلی نمبر ص ۱۲۰

(۱۴) حیات شبلی ص ۵۸۲

(۱۵) ایضاً ص ۴۷۴

(۱۶) معارف نومبر ۱۹۲۰ء بحوالہ شذرات سلیمانی ج ۱ ص ۷۸

(۱۷) شعر العجم یا ادبیات منظوم ایران ج ۲ مقدمہ مترجم

(۱۸) معارف ستمبر ۱۹۴۰ء بحوالہ شذرات سلیمانی ج ۳، ص ۲۴۷

(۱۹) ریحانۃ الادب ج ۳، ص ۱۸۳، کتاب فروشی خیام، تہران ۱۳۴۶ھ طبع دوم

(۲۰) شعر العجم مقدمہ ج ۳ فارسی ترجمہ، تہران

(۲۱) ۱- دکتر ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات در ایران، تہران۔ ۲- احمد گلچین معانی، کاروان ہند ج اول، مشہد ۱۳۶۹ ش، ۳- ج۔ توفیق سبحانی، نگاہی بتاریخ ادب فارسی در ہند، تہران۔ ۴- علی اصغر حکمت، از سعدی تا جامی تہیران ۱۳۳۷ ش

(۲۲) لغت نامہ دھخدا ۱-۱ شمارہ مسلسل ۷۳، تہران ۱۳۴۰ ش

(۲۳) حیات شبلی ص ۸۱۶

(۲۴) شذرات سلیمانی ج ۳، ص ۱۹۳

(۲۵) ایضاً ص ۱۲۷

(۲۶) ایضاً ج ۲، ص ۳۶۲

(۲۷) الاعلام ج ۳، ص ۷۲، طبع دوم بیروت ۱۹۸۹ء

(۲۸) موج کوثر ص ۲۳۴، تاج کمپنی دہلی ۱۹۹۹ء

☆☆☆

عہد حاضر میں

علامہ شبلی کی تجویزوں اور منصوبوں کی معنویت

علامہ شبلی نے ۳۲ برس تک ملک وملت کو اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم، اپنی نوانجیوں سے پر شور اور اپنی ولولہ انگیزیوں سے بیدار رکھا اور مختلف اسلوب و انداز میں مسلمانوں کے عزت و وقار اور اسلام کی عظمت و سربلندیوں کا سامان کیا، اس کے لئے انھوں نے قوم کے سامنے متعدد تجاویز پیش کیں اور علمی و عملی جدوجہد کے منصوبے بنائے جو نہ صرف ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے بلکہ ہماری تاریخ کا روشن ترین باب بھی ہے، راقم نے اس مضمون میں ان کے اسی طرح کے منصوبوں اور تجویزوں کا ذکر کیا ہے۔

شبلی کی انفرادیت ان کا جذبہ اخلاص، دینی غیرت اور ملی حمیت ہے، انھیں جہاں اسلام اور مسلمانوں کی فوز وفلاح اور روشن مستقبل نظر آیا وہاں پورے جوش و جذبہ کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے، تحریک علی گڑھ اور تحریک ندوۃ العلماء سے ان کی وابستگی نامورانِ اسلام کی تصنیف، شبلی کالج اور دارالمصنفین کا قیام اور سب سے آخر سیرۃ النبی کی تالیف و تدوین ان کے اسی فکر و تصور کا نتیجہ ہیں کہ مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں عزت و وقار اور اولوالعزمی کے ساتھ رہیں، اسلام اور اسلامی اقدار پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے پائے، ان کی تصنیفات بالخصوص یورپ کی چیرہ دستیوں اور مخالفین اسلام کی ریشہ دوانیوں کے جوابات ان کے اسی جذبے کے پرتو ہیں۔

۱۸۸۳ء میں وہ علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہوئے، بلاشبہ سرسید کی صحبت اور علی گڑھ کی فضا نے ان کے فکر و خیال میں انقلاب برپا کیا، اسی زمانہ (۱۸۸۳ء) میں انھوں نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد ڈالی تاکہ قوم کے بچے عصری علوم سے

آراستہ ہوکر قومی ترقی کے دست و بازو بنیں، اس اسکول کی انھوں نے علی گڑھ سے نگرانی و سرپرستی کی، ان کی اسی جدوجہد اور اخلاص کا نتیجہ ہے کہ آج نیشنل اسکول مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے بعد مسلمانوں کا عظیم الشان ادارہ تسلیم کیا جاتا ہے، اس کے قیام کے پس پشت علامہ شبلی کے کیا مقاصد تھے اور وہ کس قدر انھیں پورا کرسکا، ایک صدی بعد اس کا جائزہ ضروری ہے، اس سلسلے میں مکاتیب شبلی، سے جو باتیں واضح ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں:

[۱] انگریزی کی تعلیم اور اس میں مہارت پیدا کرنا (۱)

[۲] فارسی میں اچھی استعداد پیدا کرنا (۲)

[۳] اعلیٰ مذہبی تربیت گاہ بنانا (۳)

ایک صدی سے زائد عرصے میں اس اسکول نے غیر معمولی ترقی کی ہے اور بڑے باصلاحیت افراد پیدا کئے جنھوں نے ہندوستان اور بیرون ملک اس کی نیک نامی میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہیں، البتہ فارسی زبان وادب کی طرف خاطرخواہ توجہ نہیں دی گئی اور نہ کوئی قابل ذکر کام انجام دیا گیا، علامہ شبلی نے غایت تعلق کی بناپر اپنا مجموعہ نظم شبلی فارسی کا حق کاپی رائٹ اسکول کو دے دیا تھا (۴) مگر افسوس کہ یہ مجموعہ ایک بار بھی اسکول کی طرف شایع نہیں کیا گیا، اسی طرح اعلیٰ مذہبی تربیت گاہ بنانے کی طرف بھی سرے سے توجہ نہیں دی گئی، اور نہ اسلامی بورڈنگ (۵) جس کا تصور شبلی نے پیش کیا تھا، آج تک قائم کیا گیا ہے۔

ضرورت ہے کہ کالج کی منتظمہ اس کی تعمیر وترقی کے منصوبے بناتے وقت بانی ادارہ کے تصورات کی روشنی میں کالج کالائحہ عمل طے کرے۔ یقیناً اس سے قوم وملت کو فائدہ پہنچے گا۔

علامہ شبلی علی گڑھ میں جب یورپ کی تاریخی تحقیقات سے واقف ہوئے تو ان کو اندازہ ہوا کہ مورخین یورپ خاص طور سے مستشرقین نے اسلام اور اسلامی اقدار وروایات اور مسلمان حکمرانوں پر شدید تنقید اور ان کی تنقیص کی تھی اور اسلام کی شبیہ خراب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا تھا، چنانچہ علامہ شبلی نے ان کے رد وابطال کا ایک جامع منصوبہ بنایا جس کے

تحت اسلامی حکومتوں کی نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھنا ان کی اولین ترجیح قرار پایا، مگر منصوبے کی طوالت کے پیش نظر اسے مختصر کر کے تاریخ بنوعباس لکھنے پر اکتفا کرنا چاہا، مگر یہ کام بھی طویل نظر آیا تو اسے اور مختصر کر کے صرف نامور فرماں روایان اسلام تک محدود کر دیا اور ہر طبقہ سے محض ایک ایک نامور کا انتخاب کیا۔

علامہ شبلی جن نامور فرماں روایان اسلام کے حالات اور کارنامے قلم بند کرنا چاہتے تھے، ان کے نام یہ ہیں: خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروقؓ، بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک، بنوعباس میں مامون الرشید، اندلسی بنوامیہ میں عبدالرحمٰن ناصر، بنوحمدان میں سیف الدولہ، سلجوقیوں میں ملک شاہ، نوریہ میں نورالدین زنگی، ایوبیہ میں صلاح الدین ایوبی، موحدین اندلس میں یعقوب بن یوسف اور ترکان روم میں سلیمان اعظم (۶)

ان ناموروں میں سے علامہ شبلی نے اپنے منصوبے کے مطابق المامون اور الفاروق لکھی اور نہایت ہی بلند رتبہ کتابیں سپرد قلم کیں، لیکن دوسرے ناموروں پر وہ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے قلم نہ اٹھا سکے اور پھر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی، حتیٰ کہ ان کے تلامذہ اور منتسبین نے بھی درخور اعتنا نہ کیا، دارالمصنفین کے قیام و استحکام کے بعد بھی اس سلسلہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی، اردو کے دوسرے اہل قلم نے ان ناموروں پر جو کتابیں لکھیں، وہ علامہ شبلی کے بلند معیار و مذاق کے مقابلہ میں کم رتبہ ہیں، یقیناً شبلی کے بلند معیار و منہج پر اگر یہ کام ہو گیا ہوتا تو ہمارے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوتا اور مسلمان حکمرانوں کے صحیح کارناموں سے بچہ بچہ واقف ہوتا۔

حکومت و سلطنت کے ان مشاہیر کے علاوہ علامہ شبلی علوم اسلامیہ کے بے تاج بادشاہوں اور اصل فرماں روایان مملکت علم و دانش کے حالات و سوانح بھی قلم بند کرنا چاہتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

"اول اول جب مجھ کو اس (نامور فرماں روایان اسلام) کا خیال

پیدا ہوا تھا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا، جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیروز انتخاب کئے تھے، ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کئے جائیں اور جو لوگ ان خاص خاص فنون میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے ان کو اس سلسلہ کا ہیرو قرار دیا جائے مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا، مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اس خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا بلکہ اس سلسلہ حکومت سے بہت سے خاندان چھوڑ دئے تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم تو امان''۔(۷)

چنانچہ علامہ شبلی نے ان بے تاج بادشاہوں میں امام ابو حنیفہؒ (سیرۃ النعمان) امام غزالی (الغزالی) اور مولانا رومؒ (سوانح مولانا روم) پر معرکہ آرا کتابیں قلم بند کیں، علامہ ابن تیمیہ اور ابن رشد پر مختصر مگر جامع مضامین سپرد قلم کئے اور وہ مزید اس سلسلے کو آگے نہ بڑھا سکے، بعد میں ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا، امام رازی (مولانا عبدالسلام ندوی) ابن خلدون (مولانا عبدالسلام ندوی) سیرت عمر بن عبدالعزیز (مولانا عبدالسلام ندوی) سیرت عائشہؓ (مولانا سید سلیمان ندوی) حیات مالک (مولانا سید سلیمان ندوی) ابن رشد (مولانا محمد یونس انصاری فرنگی محلی)، ابن تیمیہ (مولانا محمد یوسف کوکن عمری) خیام (مولانا سید سلیمان ندوی) وغیرہ دارالمصنفین کی مایہ ناز کتابیں دراصل اسی سلسلے کی مطبوعات ہیں، اس کو مزید بڑھایا جا سکتا تھا، تاہم دارالمصنفین نے اپنی بساط بھر اس کام کو انجام دیا البتہ ملک کے دوسرے اہل قلم نے اس سلسلہ کو شعوری طور پر آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یقیناً اس سلسلہ کی تکمیل سے ہمارے علمی خزانے میں گراں قدر اضافہ ہوتا اور علامہ شبلی کے فکر و خیال کی ترویج میں اس سے مدد ملتی۔

۱۸۹۶ء میں جب علامہ شبلی مدرسۃ العلوم میں پروفیسر اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

میگزین (اردو سیکشن) کے مدیر تھے، قوم کے سامنے اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز پیش کی، ان کا خیال تھا کہ یورپ میں قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو اور طبع واشاعت کے لئے متعدد انجمنیں قائم ہیں، جو بیش بہا خدمت انجام دے رہی ہیں، حتی کہ خود مسلمانوں کی نادر الوجود کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شائع کر رہی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ یہ کام ہم خود انجام دیں اور دنیا کو بتائیں کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کا کس قدر گراں مایہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ (۸)

اس تجویز کو وہ خود عملی جامہ نہ پہنا سکے اور نہ ہی اس کے لئے انھوں نے کوئی انجمن بنائی، یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین جب مسلمانوں کی کوئی نادر کتاب شائع کرتے تو وہ بڑے جوش وجذبہ کے ساتھ اس کا تعارف کراتے اور اس بات کا ذکر حسرت سے کرتے کہ یہ کام ہمارا تھا، انھیں اس پر بھی افسوس تھا کہ دنیا بھر میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں، ریاست و حکومت کے مالک ہیں پھر بھی یہ کام وہ نہیں کرتے، مقالات شبلی جلد پنجم جو نادر کتابوں کے تعارف وتبصرے پر مشتمل ہے تقریباً تمام مضامین کی ابتدا اسی حسرت و یاس سے ہوئی ہے، طبقات ابن سعد کی اشاعت پر لکھتے ہیں:

> ''ہم کو فیاض دلی سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ یورپ کو آج کل ہمارے علوم وفنون کے ساتھ جو اعتنا ہے اور جس طرح وہ ہمارے قدیم خزانوں کے بیش بہا نوادر ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کر رہا ہے، ہم خود نہیں کرتے، بلکہ نہیں کر سکتے، مسلمانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آج تک یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کیں۔'' (۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''یورپ نے ہماری یادگاروں کو زندہ کرنے میں جو کام کئے ہیں، وہ کیا کم ہیں ان ہی کی بدولت فن حرب کی وہ کتاب شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اس فن کے علمی اصول مرتب کئے تھے اور ان کا فن جنگ

موجودہ فن جنگ کا مکمل خاکہ تھا، یورپ کی بہ دولت زہراوی کی کتاب فن تشریح سے متعلق چھپ کر شائع ہوئی جس میں کئی سو آلات تشریح کی تصویریں اور ان کے استعمال کے طریقے درج ہیں...... یورپ ہی کی بہ دولت تاریخ طبری، طبقات ابن سعد اور تاریخ الحکماء وغیرہ کا پتہ لگا جو گویا دنیا سے ناپید ہوگئی تھیں۔'' (۱۰)

علامہ شبلی کے ایک خط سے ان اسباب کا پتہ چلتا ہے کہ آخر وہ کیوں یہ کام نہیں کر سکے، وہ لکھتے ہیں:

''مولوی سید علی کے کتب خانے میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر سخت حیرت زدہ رہ گیا، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے ہیں کیا کہوں اپنے علماء کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔'' (۱۱)

اپنی مفلسی اور علماء کی بدقسمتی پر انھوں نے جو آنسو بہائے وہ رائیگاں نہیں گئے، ان کی بدولت اس تجویز کی طرف توجہ دی گئی اور بالآخر ان کی خواہش پوری ہوئی، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''قدیم عربی کتابوں کی اشاعت کی جو تجویز انھوں نے ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی گو وہ اس وقت پوری نہیں ہوئی، لیکن عجیب بات ہے کہ جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انھوں نے لیا تھا، ان میں سے ایک (مناقب شافعی للرازی) کے سوا سب کتابیں ان کی زندگی میں چھپ گئیں اور دائرۃ المعارف جس کے نام سے ان کو مایوسی تھی، ان کے حبیب صمیم اور بانی کار کے خلف الرشید اور ان کی درس گاہ کے چند تعلیم یافتوں کے ہاتھوں اس کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ اس باب میں مولانا مرحوم کے اکثر ارادے پورے ہوگئے۔'' (۱۲)

علامہ شبلی کی ایک اہم تجویز مدارس اسلامیہ کے قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح سے

متعلق تھی، انھوں نے قدیم نصاب تعلیم کا گہرائی سے جائزہ لیا، کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی اور ثابت کیا کہ وہ قابل اصلاح ہے (۱۳) اور نئے زمانے اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود وہ نہ مفید ثابت ہو رہا ہے اور نہ ایسے علماء پیدا ہو رہے ہیں جو نئے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔

اس کے لئے انھوں نے علمی و عملی طور پر بڑی جدوجہد کی، ندوہ کے نصاب کو اپنی فکر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، گو انھیں پورے طور پر کامیابی نہیں ملی، تاہم یہ ان کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔

قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح کے لئے آج بھی رک رک کر صدائیں بلند ہوتی ہیں، مذاکرے اور مباحثے ہوتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے پھونکے ہوئے اس صور سے کسی کو مفر نہیں، اگر علامہ شبلی کی اصلاحات آج بھی ہو بہو قبول کر لی جائیں تو یقیناً ہمارا موجودہ علمی و تعلیمی منظر نامہ بدل سکتا ہے۔ ہماری پس ماندگی کے متعدد وجوہ میں ایک وجہ یہ بھی ہے، علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات پر عمل کر کے یقیناً اسے دور کیا جا سکتا ہے۔

علامہ مرحوم نے اس دور میں جب انگریزی تعلیم کو کفر تصور کیا جاتا تھا، اس کی حمایت کی، ان کا خیال تھا کہ اسلام پر یورپ کے حملے کا جواب اور اس کا دفاع انگریزی علوم حاصل کئے بغیر صحیح طور سے نہیں کیا جا سکتا (۱۴) وہ انگریزی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کی تعلیم بھی مسلمانوں کے لئے ضروری خیال کرتے تھے، دارالعلوم ندوہ میں انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا شعبہ قائم کیا اور اس کی تعلیم کے لئے ایک پنڈت مقرر کیا (۱۵) اس سے ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں پر آریوں کی طرف سے جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دیا جائے جو ہندی و سنسکرت سے واقفیت کے بغیر خاطر خواہ طور پر نہیں دیا جا سکتا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ مدارس کے طلبہ کے لئے انگریزی کی تعلیم پر کیوں زور دیتے ہیں تو انھوں نے ایک آہ سرد

کھینچی اور فرمایا:

"دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجمے پر رہ جائے گا اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی، اب بھی دیکھو جب غیر مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں ہے۔" (۱۶)

ایک صدی گذر جانے کے بعد علامہ شبلی کے ان افکار و خیالات کی معنویت اہل علم پر عیاں ہے، اگر ۱۰۰ سال پہلے کی پیش کردہ ان تجویزوں پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دور اندیش شبلی کے خیالات صدفی صد درست تھے اور آج ہم جن مراحل سے گذر رہے ہیں ان میں انگریزی، ہندی اور سنسکرت زبانوں کے بغیر برادرانِ وطن سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔

علامہ شبلی کے دور میں قرآن مجید کے جتنے ترجمے یورپین زبانوں میں تھے وہ سب عیسائیوں کے قلم سے تھے، جس میں انھوں نے بددیانتی سے کام لیا تھا اور جا بہ جا تاویلات و تلبیسات کی تھیں، ان ترجموں کی بنیاد پر وہ غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے اور حکمراں انگریز انھیں سے استفادہ کر کے مسلمانوں کے عائلی مسائل میں رخنہ انداز ہوتے تھے، اس لئے علامہ مرحوم کو ایک صحیح اور مستند ترجمہ قرآن کا خیال پیدا ہوا جسے انھوں نے ایک تجویز کے طور پر پیش کیا، اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ غیر مسلم قرآن مجید سے استفادہ کریں تو صحیح اور مستند ترجمہ ان کے پیش نظر رہے، علامہ کی اس تجویز کی بڑی پذیرائی ہوئی اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی گئیں، نواب سید حسین بلگرامی نے اس کا ذمہ لیا، بعض رؤسا نے اس کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی، چنانچہ پانچ پاروں کا ترجمہ شائع ہوا (۱۷) مگر پھر علامہ شبلی نے اچانک وفات

پائی اور یہ کام آگے نہ بڑھ سکا، البتہ بعد کے لوگوں نے یہ کارنامہ انجام دیا، اور اس سلسلہ کی علامہ کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور اب کئی معتبر انگریزی ترجمے دستیاب ہیں۔

علامہ شبلی شعر العجم سے پہلے شعر العرب لکھنا چاہتے تھے، مگر وہ شعر العجم پر شعر العرب کو ترجیح نہ دے سکے، تاہم یہ خیال ان کے دل سے نہ گیا، ابن رشیق کی کتاب العمدہ چھپ کر آئی تو ان کے خیال میں پھر تحریک پیدا ہوئی اور اس پر ایک طویل تبصرہ لکھ کر اس کا آغاز کیا، (۱۸) تاہم وہ اسے پورا نہ کر سکے، ان کے بعد ان کے شاگرد عزیز مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا مگر وہ بھی اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے اور اب تک یہ کام شعر العجم کے معیار و مذاق کے مطابق انجام نہ پا سکا، یہ کتاب بھی اگر وجود میں آجاتی تو شعر العجم ہی کی طرح اردو میں ایک معرکہ آرا کتاب کا اضافہ ہوتا اور جس طرح شعر العجم نے فارسی شعر و ادب کا مذاق پیدا کیا اسی طرح عربی زبان و ادب کا مذاق پیدا ہوتا جو ہمارے لئے نسبتاً زیادہ مفید ہوتا۔

علامہ شبلی نے ایک اور تجویز علم کلام سے متعلق پیش کی تھی، ان کا خیال تھا کہ جدید علم کلام نامکمل اور ناقص ہے، اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ عباسیوں کے زمانے میں جب فلسفہ اور علوم عقلیہ کا رواج ہوا تو سیکڑوں ہزاروں اشخاص کے مذہبی عقائد متزلزل ہو گئے (۱۹) چنانچہ مسلمانوں میں علوم عقلیہ اور فلسفہ کے ماہرین پیدا ہوئے اور انھوں نے اس سیلاب کو روکا، موجودہ دور میں جب کہ یورپ کی تحقیقات عام ہو رہی ہیں اور جدید خیالات قوم میں پھیل رہے ہیں علماء میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے یورپ کا فلسفہ اور سائنس حاصل کیا ہو (۲۰) اس لئے ضروری ہے کہ ایک کمیٹی "مجلس علم کلام" بنائی جائے، جس میں بقول علامہ شبلی:

> "قدیم علماء، اور جدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کے لوگ ممبر ہوں، قدیم علماء اس بات کا فیصلہ کریں کہ جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں ان میں سے کون سے مسائل در حقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں اور کون

سے نہیں، جدید تعلیم یافتہ گروہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ جن چیزوں کو فلسفہ کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فلسفہ کے مخالف ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہے۔'' (۲۱)

اس کمیٹی میں انھوں نے قدیم و جدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کو شامل کیا تھا، جس میں مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا حمید الدین فراہی اور مولوی عبدالقادر بی اے شامل تھے (۲۲)

اس سلسلے میں انھوں نے مذکورہ اشخاص سے خط و کتابت کی اور اسے ایک مجلس کی شکل دینے کی کوشش کی، مگر یہ کام اس سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ خود علامہ شبلی نے علم الکلام کی اردو میں ترتیب و تدوین کے لئے بڑی جدوجہد کی ایک وسیع اور مہتم بالشان علمی منصوبہ بنایا، الغزالی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایہ ناز ہے آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کے چار حصے قرار دیئے۔

[۱] علم کلام کی ابتداء اس کی مختلف شاخیں، عہد بہ عہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔

[۲] علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کامیابی حاصل کی؟

[۳] ائمہ علم کلام کی سوانح عمریاں۔

[۴] جدید علم کلام (۲۳)

اس منصوبے کے تحت انھوں نے علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم جیسی معرکہ آراء کتابیں سپرد قلم کیں لیکن یہ سلسلہ بھی نامکمل رہا، خاص طور سے جدید علم کلام کا دوسرا حصہ جس کا نام انھوں نے علوم القرآن قرار دیا تھا وہ نہیں لکھ سکے۔ (۲۴) اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچانے کے متعدد اسباب ہیں اور سب سے بڑی وجہ وہ طوفان تھا جو ان کتابوں کی اشاعت پر برپا کیا گیا حتی کہ شبلی کو فتوی تکفیر کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ دراصل وہ ان کتابوں کے

ذریعہ علماء کو اس خاص سطح پر لانا چاہتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

"میں علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا علم الکلام پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے (۲۵)

علم کلام کے سلسلے میں علامہ شبلی خود اپنے مقاصد میں کسی قدر ناکام رہے، پھر ان کے بعد کون توجہ دیتا، حالانکہ ہزار مخالفت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید علم کلام کی تدوین ضروری کام تھا جو نہ ہو سکا، شبلی کے بعد بھی اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

علامہ شبلی نے تقریباً سو سال پہلے یہ منصوبہ بنایا تھا، موجودہ دور میں یہ کام اور زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے، سائنسی تحقیقات کا یہ دور عروج ہے، روز نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں، اس لیے علامہ شبلی کے دور کے مقابلے میں آج مجلس علم کلام اور اس کے مقاصد کا حصول وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔

علامہ شبلی مدۃ العمر مخالفین اسلام بالخصوص مستشرقین کے حملوں کا جواب دیتے رہے، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین، مضامین عالمگیر وغیرہ مقالات اور ان کی تصنیفات المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، الانتقاد اور خود سیرۃ النبی دراصل مستشرقین کے جوابات ہی ہیں، ان کے آخری دور میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا اور آریوں نے بڑے منظم انداز میں مسلمانوں کے عقائد و خیالات پر حملے شروع کئے اور نو مسلموں کو دوبارہ ہندو بنانے کی تحریک چلائی، اس کے مقابلہ کے لئے علماء میں جو شخص سب سے پہلے میدان میں آیا وہ علامہ شبلی تھے، انھوں نے ارتداد سے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا، دیہاتوں میں واعظ بھیجے اور اپنے مضامین سے تمام اہل علم اور دردمندان قوم کو اس کی طرف متوجہ کیا، اس کے لئے انھوں نے متعدد منصوبے بنائے اور حفاظت و اشاعت اسلام کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اس کی تفصیل مقالات شبلی جلد ہشتم اور حیات شبلی میں موجود ہے (۲۶)

اس سلسلے میں علامہ شبلی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے،

جس میں تمام صوبوں کے نمائندے ہوں، تنظیم کا سکریٹری تمام کارروائی پر نظر رکھے، واعظ مقرر کئے جائیں، جو دو-دو، چار-چار مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، واعظوں کے تیار کرنے کا بھی انتظام کیا جائے، جابہ جا مکاتب قائم کئے جائیں، جن میں قرآن اور اردو کی تعلیم دی جائے، دیہاتوں میں جو مکاتب ہیں، ان میں مسلمان مدرسین مقرر کرائے جائیں، دینیات کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے، جو انگریزی خواں طلبہ کے لئے مفید ہو، ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو آریوں سے مناظرہ و مباحثہ کرے اور جو بھاشا اور سنسکرت سے بھی واقف ہو، آریوں کے مہمات عقائد کے رد میں رسالے شائع کئے جائیں (۲۷) غرض منظم انداز میں آریوں کا مقابلہ کیا جائے۔

علامہ شبلی نے اپنے مضامین میں اشاعت و حفاظت اسلام کا پورا خاکہ مرتب کردیا ہے، داخلی ضرورتوں کے ساتھ خارجی ضرورتوں کو بھی انھوں نے تفصیل سے واضح کیا ہے، ان کا خیال تھا کہ مخالفین کے اعتراضات اور حملوں کا جواب دینا ہی کافی نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اسلام کی سچی تعلیمات کو بھی عام کیا جائے، وہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہم بے کس بن کر صرف دوسروں کے حملہ سے اپنے آپ کو بچائیں، اسلام اس لئے آیا تھا کہ تمام دنیا پر اپنے آپ کو پیش کرے، اس لئے ضرور ہے کہ ہم دوسری قوموں میں اپنے واعظ اور داعی بھیجیں جو اسلام کی تبلیغ کریں، یہ قطعی ہے کہ اگر صحیح طور سے مذہب اسلام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا جائے تو ہزاروں لاکھوں اشخاص نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی اسلام کو بے تکلف قبول کر سکتے ہیں۔" (۲۸)

علامہ شبلی کے یہ منصوبے اور تخیلات اس وقت کے ہیں جب ملک میں کوئی قابل ذکر ملی تنظیم موجود نہ تھی، بعد میں جو تنظیمیں وجود میں آئیں جن کے ہاتھوں میں آج ملت کی قیادت ہے کیا ان کے دستور العمل اور عملی جد و جہد کا طریقہ کار علامہ شبلی کے مماثل نہیں؟ درحقیقت بعد کے ہندوستان میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا وہ علامہ مرحوم ہی کے تخیلات کی بازگشت ہے۔

ملک کی موجودہ صورت حال میں علامہ شبلی کے منصوبہ اشاعت اسلام کی افادیت کم نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہی طریقہ کار اپنا کر ایک بار پھر مخالفین اسلام کے عزائم کے تار پود کو بکھیرا جا سکتا ہے۔

ناموران اسلام کے سوانح لکھنے کے دوران علامہ شبلی کو بار بار خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور کا نام آنا چاہئے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا، چنانچہ انھوں نے سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کی ایک عظیم الشان تجویز قوم کے سامنے رکھی (۲۹) اور قوم نے اس کی پذیرائی بھی کی، علامہ شبلی نے اس عزم کے ساتھ سیرت نبوی کی تالیف کا آغاز کیا کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی (۳۰)

علامہ شبلی کے اس جذبہ اخلاص نے واقعی ایک ایسی سیرت قلم بند کرادی جو آج تک اپنا جواب نہیں رکھتی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرت کے سارے ذخیرہ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں منفرد حیثیت رکھتی ہے حتی کہ عربی زبان میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی (۳۱)

علامہ شبلی سیرت کی ابھی دو ہی جلدیں لکھ سکے تھے کہ ان کا وقت آخر آپہنچا، بقیہ جلدیں ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھیں اور سیرت کا دائرہ بہت وسیع کر دیا، جو سات جلدوں پر اختتام کو پہنچا۔

علامہ شبلی نے سیرت کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں ایک جلد (پنجم) میں مستشرقین کے اعتراضات اور ناروا الزامات کا رد و ابطال کرنا تھا، وہ سپرد قلم نہ ہو سکا، سیرۃ النبیؐ میں اگرچہ جا بجا مورخین یورپ کے اعتراضات کی تردید کی گئی ہے تاہم علامہ شبلی کے اس خیال کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس جلد کو قلم بند کیا جائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی میں اس کا کسی کو خیال نہیں آیا، البتہ ان کی وفات

کے بعد دارالمصنفین کے ایک اہل قلم کارکن ابوعلی اثری مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس اہم کام کے لئے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا نام پیش کیا (۳۳) مگر اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ تھا کہ مستشرقین کی تردید کی کوشش سے آپ ان کی اہمیت بڑھاتے ہیں اور سرفرازی کرتے ہیں وہ اس کے مستحق نہیں، ان کے لغو اعتراضوں سے اعتنا نہ کرنا ہی بہتر جواب ہے۔ (۳۴) اس لئے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہ کر سکے، غالباً شبلی کے اس نقطۂ نظر کے مطابق سیرۃ النبیؐ پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔

رفقاء دارالمصنفین یا دوسرے اہل قلم اس کی طرف توجہ دیں تو علامہ شبلی کے ایک خیال کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ میرے کرم فرما پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی جن کی سیرت پر بڑی گہری نگاہ ہے، اس کام کے لئے میری نظر میں سب سے زیادہ موزوں اور معتبر شخص ہیں۔

علامہ شبلی کے منصوبہ سیرت کی پانچویں جلد گو نہ لکھی جا سکی تاہم مستشرقین کے لغو اعتراضات والزامات کی بیخ کنی ان کے تلامذہ کا خاص مطمح نظر رہا اور وہ اپنی کتابوں اور مقالات میں یہ فریضہ انجام دیتے رہے اس سلسلے کا ان کا عظیم الشان کارنامہ وہ سمینار ہے جو اسلام اور مستشرقین (Islam and oriantalist) کے عنوان سے فروری ۱۹۸۲ء میں منعقد ہوا جس میں دنیا بھر کے اہل قلم اور دانشوروں نے شرکت کی اور اپنے تحقیقی وتنقیدی مقالات پیش کئے جسے دارالمصنفین نے سات ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے اور جو اپنے موضوع پر سب سے وقیع کام ہے اس میں مستشرقین کے بیشتر لغو اعتراضات کا جائزہ آ گیا ہے بلاشبہ یہ علامہ شبلی کی بنیادی فکر پر عمل کا نتیجہ ہے۔

علامہ شبلی نے اپنے عہد میں مورخین اور مستشرقین یورپ کے افکار وخیالات سے آگاہی حاصل کی اور ان کے رد وابطال میں قلم اٹھایا لیکن ان کے بعد یہ کام منظم انداز میں نہ ہو سکا اور آج تو شاید ہی کوئی اہل قلم ہو جو یورپ کے موجودہ علمی وتحقیقی کارناموں سے پورے طور پر واقفیت رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ ہمارے علمی کاموں پر یورپ کے اعتراضات کیا کیا ہیں، حالانکہ علامہ شبلی کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ یورپ کے الزامات کا تار پود بکھیر دیا جائے اور ان پر اسلام کی

عظمت واضح کردی جائے۔ ظاہر ہے یہ ایک دائمی فکر تھی، اس کا دائرہ عہد شبلی تک محدود نہ تھا۔

صحافت کے میدان میں مسلمانوں کا اپنا کوئی اخبار نہیں تھا، اس کا احساس سب سے پہلے علامہ کو ہوا، چنانچہ انھوں نے اس کے لئے بڑی تگ ودو کی۔ ۱۹۱۲ء میں سید میر جان نے لکھنؤ سے مسلم گزٹ جاری کیا جو دراصل علامہ شبلی ہی کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ تھا، اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے (۳۵) ہندوستان میں مسلمانوں کا اب تک کوئی آزاد اخبار نہیں ہے جو ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکے، مولانا شبلی کی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اس زمانہ میں اس کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ انھوں نے سید میر جان کو نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اس کی ذمہ داری بھی قبول کی، مولوی وحید الدین سلیم کو علی گڑھ سے بلا کر ایڈیٹر بنایا، ان کی کوششوں سے بہت جلد مسلم گزٹ مقبولیت کے آسمان پر چمک اٹھا مگر قوم کی بدمذاقی سے علامہ شبلی کی یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی (۳۶) ایک ایسا اخبار جو مسلمانوں کے مسائل کو واضح اور مسلم کاز کی ترجمانی کرے جاری کر کے علامہ شبلی کی ایک خواہش کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔

انگریزوں کے دور حکومت میں علامہ شبلی نے وقف علی الاولاد کے لئے تحریک چلائی اور بالآخر محمد علی جناح کے تعاون سے کامیابی ملی (۳۷)، اسی طرح انھوں نے تعطیل جمعہ کے لئے بھی جدوجہد کی اور تعطیل منظور ہوئی (۳۸) اگر ہم اس سے سبق لیں تو یقیناً آزاد ہندوستان میں کامیابی سے ہم کنار ہوں گے، خاص طور سے تعطیل جمعہ کے لئے تحریک برپا کی جا سکتی ہے۔

علی گڑھ میں علامہ شبلی کی تحقیقات کا آغاز تاریخی تصحیحات سے ہوا، انہی سے متاثر ہو کر سر سید احمد خاں نے صیغہ اغلاط تاریخی کی تصحیح قائم کیا اور علامہ شبلی کے مضامین کو اس میں شامل کیا، علی گڑھ کے بعد علامہ شبلی نے ندوہ میں یہ شعبہ قائم کیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کو اس کا سکریٹری مقرر کیا، سید صاحب نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا (۳۹) علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی ندوہ سے علاحدگی کے بعد پھر یہ کام ندوے میں نہ ہو سکا، البتہ سید صاحب نے

جولائی ۱۹۱۶ء میں جب ماہنامہ معارف جاری کیا تو اس سلسلہ کو پھر شروع کیا، اس وقت سے اب تک دارالمصنفین حتی المقدور یہ خدمت کسی نہ کسی نوع سے انجام دے رہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس بڑے پیمانہ پر یہ کام ہونا چاہئے تھا نہ ہو سکا، آج جب انگریزوں کے ساتھ برادران وطن بھی تاریخی غلطیاں کر رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں پر ہر طرح کے ناروا الزامات عائد کرتے رہتے ہیں، شبلی کے اس تاریخی شعبہ کو قائم کر کے بے سروپا الزامات کا رد کیا جا سکتا ہے۔

۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے الہلال کلکتہ میں دارالمصنفین کی تجویز قوم کے سامنے پیش کی، اسے وہ اپنا آخری میدان عمل اور زمرہ مصنفین کی دائمی خدمت خیال کرتے تھے (۴۰) دارالمصنفین کا بنیادی مقصد اعلی مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ اور ان کے طبع و اشاعت کا انتظام کرنا تھا (۴۱) بلا شائبہ مبالغہ یہ ادارہ تقریباً ایک صدی سے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم ہے، تقریباً ڈھائی سو بلند پایہ اور معرکہ آرا کتابیں اپنے مصنفین سے لکھوا کر شائع کر چکا ہے، اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ آج قومی سرمائے میں سب سے قیمتی علمی ذخیرے کا اضافہ دارالمصنفین نے کیا ہے اور سب سے زیادہ اہل قلم اور مصنفین اسی کے زیر اثر پیدا ہوئے، بلاشبہ یہ سب علامہ شبلی کا فیضان ہے۔ (۴۲)

دارالمصنفین نے سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، تبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، شعروادب، سوانح، مکاتیب، سفرنامے، غرض مختلف النوع موضوعات پر گراں قدر کتابیں شائع کیں اس ادارے نے حتی المقدور زمانہ کی رفتار سے ہم آہنگ ہو کر نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں پر علمی کام کیا، مالی وسائل کی کمی، مناسب افراد کی نایابی کے باوجود اس ادارہ نے جو علمی ذخیرہ قوم کے سامنے پیش کیا اس کی مثال شاید ہی مل سکے، تاہم بہت سے کام ایسے بھی ہیں جو وہ انجام نہ دے سکا، مثلاً سیرۃ النبی پر مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا، تاریخ اسلام کی چار جلدوں کے بعد یہ سلسلہ رک گیا، تاریخ اندلس حصہ اول کے بعد بقیہ حصے

شائع نہ ہو سکے، تاریخ ہند پر کوئی مبسوط اور مدلل کتاب بھی نہ لکھی جا سکی، شبلی کے سلسلہ ناموران اسلام کا ایک حصہ بھی سپرد قلم نہ ہو سکا، ناموران اسلام اور حکمائے اسلام پر جس قدر کام ہونا چاہئے تھا وہ بھی نہ ہو سکا، ایسا محض مالی دشواریوں، اہل علم اور ارباب دولت کی بے توجہی کی وجہ سے ہوا، یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دارالمصنفین جو علم وفن کا سب سے بڑا ادارہ تھا قوم کی بدمذاقی کی وجہ سے اپنے عزائم کی تکمیل شایان شان نہ کر سکا، قومی ترقی کا سارا دارومدار علمی، دماغی اور ذہنی ترقی پر منحصر ہوتا ہے، علامہ شبلی نے اس کام کے لئے یہ ادارہ قائم کیا تھا مگر قوم کے صاحب ثروت افراد اس ادارہ حکمت ودانش کو خاطر خواہ ترقی دینے میں مانع رہے، اگر آج بھی براہیم سا ایماں پیدا ہو جائے تو دارالمصنفین انداز گلستاں پیدا کر سکتا ہے۔

علامہ شبلی کے پیش نظر ایک علمی رسالہ معارف کا اجرا بھی تھا، اس کا خاکہ بھی وہ بنا گئے تھے مگر ان کی بے وقت موت نے اسے عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیا، ان کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندویؒ نے علامہ کی خواہش کے مطابق جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف جاری کیا، معارف اس وقت سے اب تک بلاناغہ شائع ہو رہا ہے، سیکڑوں موضوعات پر ہزاروں علمی وتحقیقی نگارشات شائع ہو چکی ہیں (۴۳)، جس کی برصغیر کی تاریخ میں مثال نہیں مل سکتی، اس کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں، اس کی اہمیت شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس قول سے ظاہر ہے کہ

"معارف ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے (۴۴)

قومی ترقی کے لئے علامہ شبلی نے وقتاً فوقتاً جو تجاویز پیش کیں اور جو منصوبے بنائے یہ ان کا ایک اجمالی جائزہ ہے، جس سے دور حاضر میں شبلی کی معنویت پورے طور پر عیاں ہو جاتی ہے، یقیناً شبلی کے ان منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہم اپنے قوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

معارف یہ اپنی نوعیت کا انوکھا مقالہ ہے، جس میں حیات شبلی اور خود علامہ مرحوم کے مکاتیب کی مدد سے ان کے عزائم اور منصوبوں کو از سر نو بڑے سلیقے سے مرتب

کیا گیا ہے، جس کے لئے لائق مقالہ نگار داد و تحسین کے مستحق ہیں، مگر یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ علامہ مرحوم کے عہد اور موجودہ عہد میں بھی اب بہت تغیر ہو چکا ہے، اس وقت جن چیزوں کے لئے حالات سازگار تھے اب نہیں رہ گئے ہیں، زمانے کے حالات بدلنے سے نئے تقاضے اور ضرورتیں سامنے آتے ہیں، اور ان کے مطابق ترجیحات بھی بدلنی پڑتی ہیں۔

ہندوستان خصوصاً شمالی ہندوستان میں بدلے ہوئے حالات میں شبلی نیشنل اسکول بلکہ اب شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے لئے متوخر الذکر منصوبے کو بہ روئے کار لانا آسان نہیں ہے، فارسی زبان کی اہمیت مسلم ہے، اس کے بغیر اچھی اردو نہیں لکھی پڑھی جاسکتی، مگر اسے تو مدارس نے بھی ختم کر دیا، نئے مضامین کی کثرت و ضرورت کی وجہ سے فارسی کے لئے گنجائش نکالنا مشکل ہو گیا ہے، تاہم شکایت بجا ہے اور کالجوں اور مدرسوں دونوں کو اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

نامورانِ اسلام کے سلسلے میں جو فرماں روایانِ اسلام علامہ مرحوم کے پیش نظر تھے ان پر براہ راست نہ سہی لیکن تاریخ اسلام اور تاریخ دولت عثمانیہ پر دارالمصنفین میں جو کام ہوا ہے، اس سے اس کی کسی حد تک تلافی ہوئی ہے، خود ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اکثر فرماں رواؤں کے عہد میں جو مشاہیر علم گزرے ہیں، ان پر دارالمصنفین کا کام وقیع ہے۔

علوم اسلامیہ کی تاریخ و تدوین اور ہر ہر فن کے اکابر و مشاہیر کے سوانح قلم بند کرنا بھی علامہ مرحوم کے منصوبے میں شامل تھا، اس سلسلے کی کئی کتابوں کا مقالہ نگار نے ذکر کیا ہے، مگر بعض ناموں کا ذکر رہ گیا ہے جیسے سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، سیرت عائشہؓ اور اگر اس دائرے کو وسیع کریں تو حیات شبلی اور حیات سلیمان کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

علم کلام اور جدید فلسفہ کے علاوہ اصل اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے

مشاہیر کے حالات بھی قلم بند کئے گئے ہیں۔

تاہم اب بھی بہت سارے کام تشنۂ تکمیل ہیں جن کی طرف بجا طور سے مقالہ نگار نے توجہ دلائی ہے جو کرنے کے کام رہ گئے ہیں، اس میں وسائل کی کمی ہی نہیں، افراد کی کمی بھی مانع بنی ہے، مقالہ نگار نے خود علمی بدمذاقی کا بار بار ذکر کیا ہے اولاً تو پتہ مار کام کرنے اور جامع کمال اشخاص کا فقدان ہے اور جو ہیں بھی ان کو تن آسانی اور شہرت و نام وری کی طلب اس طرف راغب نہیں ہونے دیتی۔ (ضیاء الدین اصلاحیؒ معارف فروری ۲۰۰۸ء)

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی، ج ۱ ص ۶۸، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء

(۲) ایضاً ص ۶۶

(۳) ایضاً ص ۲۶ و ص ۴۴-۴۵

(۴) ایضاً ص ۹۳

(۵) ایضاً ص ۴۴-۴۵

(۶) المامون ص ۸-۹ دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء

(۷) سیرۃ النعمان دیباچہ، ص ۷۔ مکتبہ اعزازیہ دیوبند (ب۔ت)

(۸) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۸۹۶ء ص ۲۱۶

(۹) مقالات شبلی ج ۴ ص ۱

(۱۰) ایضاً ج ۴ ص ۶۷

(۱۱) مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۱۳۲

(۱۲) مقالات شبلی ج ۸ ص ۶-۷ دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۷۲ء

(۱۳) حیات شبلی ص ۱۳۴ دار المصنفین، اعظم گڑھ، طبع چہارم، ۱۹۸۳ء

(۱۴) ایضاً ص۴۱۶

(۱۵) ایضاً ص۴۲۱

(۱۶) ایضاً ص۲۰-۲۱

(۱۷) مقالات شبلی ج۸ ص۴۸-۵۲

(۱۸) مقالات شبلی ج۲ ص۲۹ دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع دہم ۱۹۸۸ء

(۱۹) مقالات شبلی ج۸ ص ۵۳

(۲۰) ایضاً ص ۵۴

(۲۱) ایضاً ص ۵۴و۵۵

(۲۲) ایضاً ص۵۵

(۲۳) دیباچہ الغزالی ص ۳

(۲۴) دیباچہ الکلام ص ۱

(۲۵) مکاتیب شبلی ج۱ ص۲۱۰

(۲۶) مقالات شبلی ج۸ ص۱-۱۵، وحیات شبلی ص۵۷۵-۵۷۴

(۲۷) مقالات شبلی ج۸ ص۱-۲

(۲۸) ایضاً ص۱۰

(۲۹) ایضاً ص ۳۲

(۳۰) مکاتیب شبلی ج۱ ص ۲۴۲

(۳۱) ماہنامہ معارف ''سلیمان نمبر'' ص ۱۷۸

(۳۲) مقدمہ سیرۃ النبیؐ ج۱ ص۶۶

(۳۳) ماہنامہ الرشاد مئی ۱۹۸۳ء ص ۴۹

(۳۴) ایضاً جون، جولائی ۱۹۸۳ء

(۳۵) حیات شبلی ص۶۱۱ - ۶۱۴

(۳۶) ایضاً

(۳۷) حیات شبلی ص ۵۴۶-۵۴۸

(۳۸) ایضاً ص ۵۴۸-۵۵۲

(۳۹) ایضاً ص ۵۲۳-۵۲۷

(۴۰) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۹۳

(۴۱) تعارف دارالمصنفین، مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

(۴۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'دارالمصنفین کی تاریخی خدمات' مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

(۴۳) اشاریہ معارف۔ محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی۔ ۲۰۰۶ء

(۴۴) اقبال نامہ حصہ اول ص ۸۰



کتابیات

﴿الف﴾

(۱) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۹ء

(۲) المامون۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۲ء

(۳) الفاروق۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۲ء

(۴) الغزالی۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۷ء

(۵) الکلام۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۲ء

(۶) اشخاص وافکار۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۷۳ء

(۷) انشائے ماجدی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ ۱۹۹۱ء

(۸) افادات مہدی۔ مہدی بیگم۔ شیخ مبارک علی، لاہور۔ ۱۹۴۹ء

(۹) اردو ادب میں فن سوانح نگاری۔ الطاف فاطمہ۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی (ب ت)

(۱۰) اردو میں سوانح نگاری۔ سید شاہ علی، کراچی۔ ۱۹۶۱ء

(۱۱) اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر۔ اوم پرکاش پرساد۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ ۱۹۹۰ء

(۱۲) اردو نثر میں سیرت رسولؐ۔ ڈاکٹر انور محمود خالد۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ ۱۹۸۹ء

(۱۳) از سعدی تا جامی (ترجمہ براؤن) علی اصغر حکمت، تہران۔ ۱۳۳۷ش

(۱۴) اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد۔ دائرہ ادب پٹنہ۔ ۱۹۸۳ء

(۱۵) اردو تنقید کا ارتقاء۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ۔ ۱۹۸۸ء

(۱۶) اقبال نامہ حصہ اول۔ شیخ عطاء اللہ۔ شیخ مبارک علی، لاہور۔ ۱۹۵۰ء

(۱۷) ابوالعلا، مالہ وماعلیہ۔ عبدالعزیز میمنی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ

(۱۸) الفاروق-ایک مطالعہ۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی۔ ادارہ علوم اسلامیہ علی گڈھ ۲۰۰۴ء

﴿ب﴾

(۱۹) باقیات شبلی۔ مشتاق حسین۔ آزاد کتاب گھر، دہلی۔ ۱۹۶۴ء

﴿ت﴾

(۲۰) تنقیدی نقوش۔ عبدالقیوم۔ مشتاق بک ڈپو، کراچی۔ ۱۹۶۳ء

(۲۱) تعارف دارالمصنفین۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ

(۲۲) تنقیدیں۔ خورشید الاسلام۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۶۴ء

(۲۳) تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ ۱۹۶۴ء

(۲۴) تاریخ ہندوستان جلد ہشتم۔ منشی ذکاء اللہ۔ علی گڑھ۔ ۱۹۱۷ء

(۲۵) تاریخ التمدن الاسلامی۔ جرجی زیدان۔ الہلال مصر۔ ۱۹۰۴ء

(۲۶) تاریخ ادبیات در ایران۔ ذبیح اللہ صفا۔ تہران

﴿ح﴾

(۲۷) حیات شبلی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

(۲۸) حیات سلیمان۔ شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء

(۲۹) حواشی ابوالکلام آزاد۔ مسیح الحسن۔ ثمر آفسیٹ پرنٹر دہلی، ۱۹۸۸

﴿خ﴾

(۳۰) خطوط سرسید۔ سرراس مسعود۔ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۳۱ء

(۳۱) خطوط محمد علی۔ محمد سرور۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ ۱۹۴۰ء

(۳۲) خطوط شبلی۔ محمد امین زبیری۔ ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال

﴿د﴾

(۳۳) دارالمصنفین کی ادبی خدمات۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی۔ رحیمی پریس بمبئی۔ ۱۹۷۷ء

(۳۴) دارالمصنفین کی تاریخی خدمات۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ خدابخش اورینٹل پبلک

لائبریری پٹنہ۔ ۲۰۰۲ء

﴿د﴾

(۳۵) ریحانۃ الادب۔ محمد علی مدرس۔ تہران طبع دوم۔ ۱۳۴۶ھ

﴿س﴾

(۳۶) سیرۃ النبیؐ جلد اول۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۷ء

(۳۷) سیرۃ النعمان۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۹ء

(۳۸) سوانح مولانا روم۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۲۰۰۳ء

(۳۹) سفرنامہ روم ومصروشام۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۹ء

(۴۰) سرسید اوران کے نامور رفقا۔ سید عبداللہ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ ۱۹۹۴ء

﴿ش﴾

(۴۱) شعرالعجم اول۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۴۰ء

(۴۲) شعرالعجم دوم۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۸۸ء

(۴۳) شعرالعجم سوم۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۶ء

(۴۴) شعرالعجم چہارم۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۸۶ء

(۴۵) شعرالعجم پنجم۔ علامہ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۱ء

(۴۶) شعرالعجم یا ادبیات منظوم ایران (اول تا پنجم)۔ ترجمہ: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی۔ تہران

(۴۷) شذرات سلیمانی حصہ سوم۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۸ء

(۴۸) شبلی کی علمی وادبی خدمات۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ۱۹۹۶ء

(۴۹) شبلی نامہ۔ شیخ محمد اکرام۔ صفدر پریس لکھنؤ۔ ۱۹۶۵ء

(۵۰) شبلی ایک دبستان۔ ڈاکٹر آفتاب احمد۔ ڈھاکہ

(۵۱) شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ۔ عبدالرحیم انصاری۔ پٹنہ۔ ۱۹۹۰ء

﴿ع﴾

(۵۲) عظمت کے نشاں ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ۔ ادب کدہ، اعظم گڑھ۔ ۲۰۰۵ء

(۵۳) علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ۔ خدا بخش پٹنہ۔ ۲۰۰۱ء

(۵۴) علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات ۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ۔ لکھنؤ ۱۹۸۵ء

(۵۵) علم الکلام ۔ علامہ شبلی نعمانی ۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ ۔ ۱۹۹۳ء

(۵۶) عالم گیر نامہ ۔ کاظم شیرازی ۔ کلکتہ ۔ ۱۸۶۸ء

﴿ف﴾

(۵۷) فن موازنہ کا ارتقاء ۔ سید احتشام احمد ندوی ۔ فیض المصنفین، علی گڑھ ۔

﴿ک﴾

(۵۸) کتاب نامہ شبلی ۔ اختر راہی ۔ مسلم اکیڈمی، لاہور ۔ ۱۹۸۱ء

(۵۹) کلیات شبلی ۔ مرتبہ سید سلیمان ندوی ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ ۔ ۱۹۸۷ء

(۶۰) کاروان ہند جلد اول ۔ احمد گلچیں معانی ۔ مشہد ۔ ۱۳۶۹ ش

﴿گ﴾

(۶۱) گلشن ہند ۔ مرزا علی لطف ۔ رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور ۔ ۱۹۰۶ء

(۶۲) گلزار ابراہیم مع گلشن ہند ۔ مرتبہ: محی الدین قادری زور ۔ اورنگ آباد ۔ ۱۹۳۴ء

﴿م﴾

(۶۳) موازنہ انیس و دبیر ۔ علامہ شبلی ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ ۔ طبع جدید ۔ ۲۰۰۴ء

(۶۴) مکاتیب شبلی حصہ اول ۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی ۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

(۶۵) مکاتیب شبلی حصہ دوم ۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی ۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ ۔ ۱۹۷۱ء

(۶۶) مضامین ڈار ۔ محمد ابراہیم ڈار ۔ ڈار پبلی کیشن بمبئی

(۶۷) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ ۔ ۱۹۸۵ء

(۶۸) مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ۔ عبداللطیف اعظمی ۔ شبلی اکادمی، دہلی ۔ ۱۹۴۵ء

(۶۹) مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز۔ سعید انصاری۔ ناظر بکڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۳۴ء

(۷۰) مآثر عالمگیری۔ محمد ساقی خاں مستعد۔ حیدرآباد۔ ۱۹۳۲ء

(۷۱) مقدمہ رقعات عالم گیر۔ سید نجیب اشرف ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۳ء

(۷۲) مقالات یوم شبلی۔ حافظ نذر محمد۔ مسلم اکیڈمی لاہور۔ ۱۹۸۶ء

(۷۳) مختصر حیات حمید۔ عنایت اللہ سبحانی۔ دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

(۷۴) مشاہیر کے خطوط۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء

(۷۵) مقالات شبلی جلد اول۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

(۷۶) مقالات شبلی جلد دوم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء

(۷۷) مقالات شبلی جلد سوم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۵ء

(۷۸) مقالات شبلی جلد چہارم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۳۴ء

(۷۹) مقالات شبلی جلد پنجم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۵ء

(۸۰) مقالات شبلی جلد ششم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۱ء

(۸۱) مقالات شبلی جلد ہفتم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۳۸ء

(۸۲) مقالات شبلی جلد ہشتم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۳۸ء

(۸۳) موج کوثر۔ شیخ محمد اکرام۔ تاج کمپنی، دہلی۔ ۱۹۹۹ء

(۸۴) مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ۔ نیر جہاں۔ دہلی۔ ۱۹۹۸ء



(۸۵) نگاہی بتاریخ ادب فارسی در ہند۔ توفیق سبحانی۔ تہران



(۸۶) ہم نفسان رفتہ۔ رشید احمد صدیقی۔ سرسید بکڈپو علی گڈھ۔ ۱۹۸۴ء



(۸۷) یادگار شبلی۔ شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔ ۱۹۹۴ء

خصوصی شمارے

(۸۸) البصیر چنیوٹ (شبلی نمبر)۔ عبیداللہ خاں۔ اسلامیہ کالج چنیوٹ۔ ۱۹۵۷ء

(۸۹) ادیب علی گڑھ (شبلی نمبر)۔ ابن فرید۔ ۱۹۰۷ء

(۹۰) فکرونظر علی گڑھ (شبلی نمبر)۔ شہریار۔ ۱۹۹۶ء

(۹۱) معارف اعظم گڑھ (سید سلیمان ندوی نمبر)۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ۱۹۵۵ء

(۹۲) نقوش لاہور (مکاتیب نمبر)۔ محمد طفیل نومبر ۱۹۵۷ء

(۹۳) نیادور لکھنؤ (یادرفتگاں نمبر)۔ امیر احمد صدیقی۔ اپریل، دسمبر ۱۹۸۸ء

عام رسائل

(۹۴) علی گڑھ گزٹ۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۱ء

(۹۵) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۱۶ء، دسمبر ۱۹۱۶ء، اکتوبر ۱۹۲۰ء، فروری ۱۹۴۰ء، ستمبر ۱۹۴۰ء، نومبر ۱۹۴۰ء، فروری ۱۹۴۷ء، دسمبر ۱۹۸۷ء، مارچ ۱۹۹۸ء، جون ۲۰۰۰ء

(۹۶) ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ مئی، جون، جولائی ۱۹۸۳ء، فروری ۲۰۰۸ء

(۹۷) جامعہ دہلی۔ اپریل جون ۲۰۰۵ء

(۹۸) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ ۱۸۹۴ء۔ ۱۸۹۵ء۔ ۱۸۹۶ء

(۹۹) ماہ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء

(۱۰۰) دلگداز لکھنؤ جون ۱۹۱۰ء

(۱۰۱) فکرونظر اسلام آباد۔ اکتوبر دسمبر ۲۰۰۲ء

(۱۰۲) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء مارچ، اپریل، اکتوبر۔ ۱۹۱۰ء

(۱۰۳) اردو ریویو، نئی دہلی۔ نومبر، دسمبر ۲۰۰۷ء۔ جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء

(۱۰۴) ترجمان الاسلام بنارس۔ اسیر ادروی۔ جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء

(۱۰۵) مجلہ المنار مصر جلد ۱۵، عدد ۱۔ جنوری ۱۹۱۲ء۔

☆☆☆

MUTAALLIQAT-E-SHIBLI

Dr. Mohd. Ilyas Azmi

مصنف کی دوسری کتابیں

(۱)	اسہل التجوید	20/-
(۲)	تذکرۃ القراء	50/-
(۳)	علم الترتیل	15/-
(۴)	علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ	50/-
(۵)	دارالمصنفین کی تاریخی خدمات	200/-
(۶)	اشاریہ ماہنامہ الرشاد	150/-
(۷)	عظمت کے نشاں	200/-
(۸)	ساحلوں کے شہر میں	25/-
(۹)	شاہ معین الدین احمد ندوی - حیات وخدمات	100/-
(۱۰)	متعلقات شبلی	200/-
(۱۱)	آسماں کیسے کیسے	زیر طبع
(۱۲)	آثار شبلی	زیر طبع
(۱۳)	چند شعرائے اعظم گڑھ	زیر طبع

ADABKADAH
Mahrajpur – Anwarganj
AZAMGARH.276001. U.P. INDIA
email: azmi408@gmail.com — dazmi32@Yahoo.com
Sites.google.com/drmohdilyasazmi
MO: 9838573645